علامہ اقبال

اور

احرار

شاعر مشرق کی زندگی کے چند تلخ حقائق

مرتبہ:

محمد اجمل شاہد

نام کتاب : علامہ اقبال اور احرار
مرتبہ : محمد اجمل شاہد
الناشر : ادارہ تحقیق الادیان-امریکہ
سن اشاعت : 2019ء
تعداد : 1000

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہٖ الکریم و علیٰ عبدہٖ المسیح الموعود

فہرست مضامین

''علامہ اقبال اور احرار''

○

○○

''علامہ اقبال اور احرار''

پر ایک تبصرہ

جہاں تک راقم کو علم ہے،''علامہ اقبال اور احرار'' اس موضوع پر لکھی جانے والی اپنی نوعیت کی اوّلین کتاب ہے۔ یہ کتاب تاریخ اور''اقبالیات'' کی کتب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے اور محض ایک اضافہ ہی نہیں، کچھ انتہائی تلخ لیکن حقیقتاً تاریخی حقائق کے محافظ صحیفہ کا مقام اور درجہ کی حامل قرار دی جا سکتی ہے۔

تاریخ کی ہر کتاب کو دراصل ایسا ہی ہونا چاہیئے لیکن بدقسمتی سے''تاریخ'' کا سب سے بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ، بقول شخصے، خدا بھی تاریخ کو نہیں بدلتا لیکن''مؤرخین''اسے بدل ڈالتے ہیں! الحمدللہ کہ زیر نظر کتاب کے فاضل مصنف مکرم محمد اجمل شاہد صاحب کا شمار ایسے نام نہاد''مؤرخین'' میں نہیں ہوتا۔

شاعر مشرق سر ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی زندگی کے بہت سے پہلو ہیں۔ان کی شخصیت ، افکار و نظریات، نظم ونثر اور پھر ان کی زندگی کے بہت سے نشیب وفراز تاریخ کی امانت اس لئے ہیں کہ وہ مملکت خداداد پاکستان کے قومی شاعر ہی نہیں مفکرِ پاکستان بھی کہلائے جاتے ہیں۔اپنے تئیں وہ خود کو''دانائے راز'' سمجھتے تھے۔اس کے باوجود گو کہ وہ خود ایک قومی رہنما کی حیثیت رکھتے تھے ان کی ساری زندگی غالبؔ کے اس شعر کی عملی تصویر بنی نظر آتی ہے کہ ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اوراس کا نتیجہ بھی غالبؔ ہی کے الفاظ میں یہ نکلا کہ ؎

پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں!

حقیقی ''راہِ کوئے یار'' انسان کو یاد نہ رہے تو وہ کبھی ایک راہبر کے پیچھے ہو لیتا ہے تو کبھی دوسرے۔ ایسی صورتحال ہو تو کسی پہ سفرِ زندگی کا راز بھلا کیسے کھل سکتا ہے۔ بحیثیت ایک بندہ بشر ہونے کے اقبالؔ بھی اس سانحہ سے ایک بار نہیں بلکہ کئی بار دوچار ہوئے۔ جس کا اعتراف انہوں نے غالبؔ کی ہی تضمین میں یہ کہہ کر کیا کہ ؎

کھلتا نہیں مرے سفرِ زندگی کا راز
لاؤں کہاں سے صاحبِ بندہ نظر کو میں

(بالِ جبریل)

چنانچہ کسی صاحبِ بندہ نظر کی مبینہ تلاش میں سرگرداں (یا اس کے تارک) اقبال کی زندگی میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب وہ ایک ایسی ''تیز رو'' تحریک (احرار) کے پیچھے ہو لئے جس کی ''تیز روئی'' خود مفکرِ احرار جناب چوہدری افضل حق صاحب کے الفاظ میں فقط اتنی تھی کہ:

''باسی کڑھی کے ابال کی طرح ہم اٹھتے ہیں اور پیشاب کی جھاگ کی طرح ہم بیٹھ جاتے ہیں۔''

(زمزم لاہور 15 / جولائی 1941ء)

کتاب ''اقبال اور احرار'' اقبالؔ کے اسی دورِ حیات کا احاطہ کرتی ہے۔ واضح رہے کہ احرار کو مولانا ظفر علی خان صاحب نے ''اسلام کے غدار'' اور انگریزی ''حکومت کا خود کاشتہ پودا'' قرار دیا تھا۔ (بحوالہ: روزنامہ زمیندار 31 اگست 1935)

فاضل مصنف نے کمال مہارت سے کتاب میں اس سربستہ راز سے پردہ اٹھایا ہے کہ آخر

وہ کیا عوامل تھے کہ شاعر مشرق علامہ اقبالؔ ایک ایسی تحریک سے مرعوب ہو کر اس کے ہمنوا بن گئے جس کی شریعت کے امیر مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب نے علی الاعلان فتویٰ جاری کیا کہ: ''جو لوگ مسلم لیگ کو ووٹ دیں گے وہ سؤر ہیں اور سؤر کھانے والے ہیں۔''

یہی نہیں بلکہ یہاں تک دعویٰ کیا کہ: ''دس ہزار جیناؔ اور شوکتؔ اور ظفرؔ جواہر لعل (نہروؔ۔ ناقل) کی جوتی کی نوک پر قربان کئے جا سکتے ہیں۔''

اور یہ کہ: ''اب تک کسی ماں نے ایسا بچہ نہیں جنا جو پاکستان تو کجا، پاکستان کی ''پ'' کا ایک نقطہ بھی بنا سکے۔''

مجھے یقین ہے کہ علامہ کی زندگی میں احرار کو اپنا یہ مکروہ چہرہ دکھانے کی جرأت نہ ہوئی ہوگی۔

مجلس احرار نے مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کی جس شدت سے مخالفت کی تھی اس سے کہیں زیادہ وہ جماعت احمدیہ کے مخالف تھے۔ اقبالؔ جو مبینہ طور پر قبل ازیں تحریک احمدیت سے متاثر تھے احرار کے ساتھ اپنے معاشقہ کے اسی دور میں اپنے اوپر احمدیت کے ساتھ وابستگی کے لگے ''الزام'' کو دھونے کی کوششوں میں مصروف نظر آئے۔

اقبالؔ کی زندگی کا یہ پہلو (اقبال اور احمدیت) بجائے خود ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ ''اقبال اور احرار'' کے موضوع پر لکھی ہوئی یہ کتاب سراسر ادھوری رہ جاتی اگر فاضل مصنف ''اقبال اور احمدیت'' کا احاطہ نہ کرتے۔

اقبالؔ اور احمدیت کے حوالہ پر مشتمل یا اس موضوع سے متعلق شائع شدہ متعدد کتب بشمول ''مظلوم اقبال'' ، ''باقیات اقبال'' ، ''زندہ رود'' ، ''اقبال اور احمدیت'' (شیخ عبدالماجد صاحب کی کتاب جو کہ زندہ رود پر بطور تبصرہ لکھی گئی تھی)، کی اشاعت کے بعد اس امر کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ جدید دور میں ان تمام کتب نیز تاریخی اور جدید شواہد کی روشنی میں

ایک ایسا مبسوط اور جامع مقالہ بطور ''مابعد تجزیہ'' یعنی META ANALYSIS کے طور پر لکھا جائے جو اس موضوع کے جملہ پہلوؤں کو معروضی طور پر دنیا کے سامنے پیش کردے۔ محترم جناب محمد اجمل شاہد صاحب اس لحاظ سے ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کمال محنت سے اس کتاب میں شاعرِ مشرق اقبالؔ اور احمدیت سے متعلق ابواب شامل کر کے وقت کی اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

واضح رہے کہ فاضل مصنف نے اس کتاب کے ذریعہ شاعرِ مشرق کے قدوکاٹھ کو کم کرنے کی کوئی شعوری یا لاشعوری کوشش نہیں کی اور نہ ہی اِس ''گناہِ بے لذت'' کے ارتکاب کی کوئی ضرورت ہے، بلکہ ان کی سیاسی، ملی اور مذہبی زندگی کے نشیب وفراز، مزید برآں ان کی تحریرات ونظریات کا معروضی تجزیہ کرتے ہوئے صرف اور صرف جملہ حقائق، بلکہ اس حوالہ سے "The Whole Truth" آج کی نسل کے سامنے پیش کر دیا ہے تا کہ وہ اپنا ذہن خود استعمال کرتے ہوئے خود اس حقیقت سے آگاہ ہوسکیں کہ ''مظلوم'' اقبالؔ ہی نہیں بلکہ تاریخی اور ابدی حقائق بھی ہیں۔

والسلام
نجم الثاقب کاشغری
آسٹریلیا

○

عرض حال

علامہ اقبال پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے تقریباً نو برس قبل وفات پا گئے تھے۔ آپ کو تحریک پاکستان میں عملی جدوجہد کا موقعہ نہ ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی حین حیات پاکستان کا تصور بھی پوری طرح نہ ابھرا تھا۔ قرارداد پاکستان ان کی وفات کے دو سال بعد منظور ہوئی۔ اس کے بعد قیام پاکستان کی مہم حضرت قائداعظم کی سرکردگی میں پورے جوش وخروش سے زور پکڑتی چلی گئی تا آنکہ یہ ملک دنیا کے نقشہ پر ایک حقیقت بن کر ابھرا۔ اس کی تخلیق میں علامہ کو حصہ لینے کا موقعہ نہ ملا۔ اس لئے علامہ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ایسی مملکت کا خواب دیکھا تھا۔ اگر اس دعویٰ کو صحیح بھی مان لیا جائے تو خواب بہت ہی دھندلا تھا۔ لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ جن ہستیوں نے نہایت محنت اور جانفشانی سے اس خواب کو شرمندہ تعبیر کیا ان کے ذکر کو عمداً پردہ اخفاء میں رکھا جاتا ہے اور ان کے بیان سے گریز کیا جاتا ہے۔ پاکستان کی تاریخ کو مسخ کرنے کا یہ عمل ایک عرصہ سے جاری ہے۔ ملک کے بعض بہی خواہ اور واقفین حال اس کے خلاف آواز بلند کرتے رہتے ہیں لیکن اس نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔

پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد علامہ کو پہلے ''شاعر پاکستان'' اور بعد میں ایران اور دیگر اسلامی ممالک کے لحاظ سے ''شاعر مشرق'' کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ملک میں ان کا یوم ولادت اور وفات بڑے اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ عام تعطیل منائی جاتی ہے۔ ملک میں اقبال اکیڈمی قائم کر دی گئی ہے جو ہر سال علامہ کی شاعری، فلسفہ اور علم کلام کو نئے سے نئے رنگ میں پیش کرتی ہے۔ اور ان کی طرف سے ہر سال متعدد کتب اشاعت پذیر ہوتی ہیں اور نظریہ اقبال کو نظریہ پاکستان سے ہم آہنگ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ اسی طرح

علامہ کی زندگی کے حالات وواقعات کومختلف انداز سے اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن انتہائی حیرتناک امر یہ ہے کہ علامہ کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو چھپانے یا غلط انداز میں پیش کرنے کی کوشش بدستور جاری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ اور ان کے خاندان کا جماعت احمدیہ سے بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔ علامہ کے بڑے بھائی اور بھتیجے مخلص احمدی تھے۔ علامہ نے زندگی بھر جماعت سے ہلکا پھلکا تعلق رکھا اور صرف اپنی زندگی سے تین سال قبل یہ تعلق بوجوہ توڑ ڈالا۔ انصاف اور عدل کا تقاضا ہے کہ جب تک ان کا تعلق رہا اسے تسلیم کیا جائے۔ لیکن اقبال اکیڈمی کی مطبوعات میں اس خوف سے کہ عوام میں علامہ کا مقام متاثر نہ ہو۔ اس لئے علامہ اور ان کے خاندان کا بانیٔ جماعت احمدیہ اور احمدیت سے تعلق کے ذکر سے عمداً گریز کیا جاتا ہے۔

یہ امر خوش آئند ہے کہ علامہ کے بیٹے جسٹس جاوید اقبال نے اپنے والد کی زندگی کے حالات پر جو کتاب ''زندہ رود'' شائع کی ہے اس میں انہوں نے اپنے تایا زاد مکرم شیخ اعجاز احمد صاحب کا ایک مضمون علامہ کے جماعت احمدیہ سے تعلق کے سلسلہ میں شامل کیا ہے۔ یاد رہے کہ مکرم شیخ اعجاز صاحب اپنے والد مکرم شیخ عطا محمد صاحب کی طرح مخلص احمدی تھے اور انہوں نے علامہ کے حالات زندگی کے متعلق ایک کتاب ''مظلوم اقبال'' شائع کی تھی۔ جسٹس صاحب نے مکرم شیخ اعجاز صاحب کے مضمون کو شائع کرنے کے بعد اس کے تاثر کو زائل کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم ان کی یہ جرأت قابل ستائش ہے کہ انہوں نے اپنے والد کے متعلق تصویر کا یہ رخ بھی بیان کر دیا ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ جسٹس جاوید اقبال صاحب کی کتاب ''زندہ رود'' پر مکرم شیخ عبدالماجد صاحب نے اپنی کتاب ''اقبال اور احمدیت'' میں سیر حاصل تبصرہ شائع کیا تھا اور جسٹس صاحب کے جماعت احمدیہ کے متعلق بیان کردہ امور کا کلی طور پر محاسبہ کیا تھا اور اصل حقائق پیش کئے تھے۔ یہ کتاب آج سے تقریباً پچیس سال قبل 1991ء میں شائع کی

گئی تھی۔ اب اس امر کی ضرورت تھی کہ تیزی سے بدلتے ہوئے زمانہ کے لحاظ سے خاص طور پر نئی نسل کے لئے ان امور کو از سرِ نو اُجاگر کیا جائے تاکہ قارئین اقبالیات کے پیش کردہ یک طرفہ مواد کے مقابل میں تصویر کے دوسرے رخ سے بھی واقف ہو سکیں۔

دوسرا اہم امر یہ ہے کہ ملک عزیز میں علامہ کے مقام کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا رجحان بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ان کی اپنی زندگی میں علماء اور شعراء نے ان کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا اور بعض ناقدین نے ان کو 'کافر' کے لقب سے نوازا جس کا شکوہ جسٹس جاوید نے اپنی کتاب میں متعدد بار کیا ہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ پہلے علامہ کو 'شاعر اسلام' اور پھر اس سے بڑھ کر 'مفکر احیائے اسلام'، 'مجدد' اور 'پیغمبرانہ اعجاز' رکھنے والے بزرگ کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ملک کی مشہور علمی اور ادبی شخصیت مکرم جمیل الدین عالی، علامہ اقبال کے متعلق اس غلط رجحان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''ہماری ساری حکومتیں اقبال کو رحمۃ اللہ علیہ اور ولی کامل ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ علامہ محمد اقبال ایک شاعر تھے اور گانا سننے کے لئے بھی جایا کرتے تھے۔ اس سے ان کی شہرت عام پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

(روزنامہ جنگ۔ جمعہ 9 اگست 1995ء)

یہ صحیح ہے کہ علامہ کے دل میں مسلم قوم کے لئے ایک سوز اور درد تھا جس کا اظہار انہوں نے اپنے اشعار میں کیا اور ان کو بیدار کرنے کی کوشش کی لیکن یہ سب شاعرانہ ترنگ تھی ورنہ عملی لحاظ سے وہی کیفیت تھی جس کا اظہار انہوں نے کئی مواقع پر کیا ؏

گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ ایک اچھے شاعر تھے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی اور اس لحاظ سے نہ صرف ان کو برصغیر میں بلکہ بین الاقوامی ادب میں ایک مقام حاصل

ہے۔ ان کی علمی، ادبی اور فکری کاوشوں کی بناء پر ان کو کئی القابات سے نوازا گیا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک موضوع مسلم قوم کی حالت زار کی نقشہ کشی ہے۔ انہوں نے مسلم قوم کو بیدار کرنے کے لئے نہایت جوشیلی نظمیں لکھی ہیں۔ نیز عصر حاضر میں اسلام کا پیغام مقبول بنانے کے لئے اپنے خطبات میں کئی امور زیر بحث لائے ہیں۔ یہ خطبات ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔ اصل خطبات انگریزی زبان میں تھے۔ ان خطبات کے متعلق متضاد آراء پائی جاتی ہیں۔ اقبالیات کے دلدادہ ان کے متعلق کہتے ہیں کہ:

''اقبال سے بہتر اسلام کو کوئی نہیں سمجھ سکا''

اور کئی علماء اور نقاد جن میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور سید سلیمان ندوی بھی شامل ہیں، اس کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور یہاں تک کہا ہے:

''اقبال اگر یہ کتاب نہ لکھتے تو بہتر تھا''

علامہ کو خود اس امر کا احساس تھا کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کسی ''مرد کامل'' کے ذریعہ ممکن ہے۔ وہ خود اپنی زندگی میں ایسے مزعومہ امام کے منتظر رہے۔ اب اقبالیات کے دلدادہ اس بات کے دعویدار ہیں کہ وہ مرد کامل خود علامہ ہی تھے اور اسلام کا احیاء اور اس کی نشاۃ ثانیہ علامہ کے پیش کردہ نظریات کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ یہ نقطہ نظر انتہائی گمراہ کن ہے۔ دین اسلام کوئی دنیوی نظام نہیں ہے بلکہ یہ ایک روحانی نظام ہے۔ اس کا نزول سیدنا حضرت خاتم النبیین ﷺ کی ذات بابرکات پر ہوا اور اس کی نشاۃ ثانیہ بھی آنحضور ﷺ کے بروز کامل کے ذریعہ اس کی قائم کردہ خلافت علیٰ مِنۡہَاجِ النُّبُوَّۃ کے ذریعہ ہوگی۔ الحمد للہ یہ بابرکت نظام قائم ہو چکا ہے اور نہایت کامیابی کے ساتھ اشاعت اسلام کا کام اکناف عالم میں ترقی پذیر ہے۔ یہ عظیم روحانی کام کسی شاعر کے بس کا روگ نہیں۔ نیز جو شخص خود اپنی زندگی میں کسی مرد کامل کی تلاش میں رہا اب اسی کو مرد کامل قرار دینا انتہائی گمراہ کن ہے۔

سر محمد اقبال اور سر محمد ظفر اللہ خان

سر زمین پنجاب میں ضلع سیالکوٹ صوبہ پنجاب کو یہ خصوصی اعزاز حاصل ہے کہ اس مردم خیز مٹی میں انیسویں صدی کے اختتام پر دو نہایت ذہین وفطین اشخاص نے جنم لیا۔ جنہوں نے آنے والے دور میں نہ صرف بڑا نام پیدا کیا بلکہ امت مسلمہ کی اپنے اپنے رنگ میں غیر معمولی خدمات سرانجام دیں اور دنیا کی تاریخ پر انمٹ نقوش چھوڑے۔ میری مراد

1۔ شاعر مشرق ڈاکٹر سر محمد اقبال

2۔ سر محمد ظفر اللہ خان

سے ہے۔ یہ عجیب امر ہے کہ ان دونوں حضرات کا تعلق اپنی جائے پیدائش سیالکوٹ کے علاوہ جماعت احمدیہ کے ساتھ بھی تھا۔ دونوں نے اپنے عہد طالب علمی میں بانئ جماعت احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی علیہ السلام سے عہد بیعت کا شرف حاصل کیا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب نے یہ عہد زندگی بھر پوری وفاداری اور اطاعت شعاری کے ساتھ نبھایا لیکن اس کے برعکس ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے اپنی زندگی کے کم وبیش تیس سال تک جماعت احمدیہ سے تعلق قائم رکھا، لیکن اپنی زندگی کے آخری تین سال میں اپنا یہ تعلق توڑ ڈالا اور جماعت کی کھلم کھلا مخالفت کا طریق اختیار کیا۔ لیکن جیسا کہ آئندہ تفصیل سے بیان کیا جائے گا کہ اس مخالفت کو اعتقادی اختلاف کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی لیکن درحقیقت اس کی وجوہ شخصی اور اقتصادی تھیں۔ نیز اس دور میں احرار نے ان کو اپنا ہم نوا بنانے کے لئے تمام جتن کئے تھے اس بناء پر عصر حاضر کے مشہور نقاد علامہ نیاز فتحپوری نے اس شخص کو جس نے علامہ اقبال کی جماعت احمدیہ کی مخالفت کا حوالہ دیا تھا اسے جواباً تحریر کیا:

”علامہ اقبال کی جس تحریر کا آپ نے حوالہ دیا ہے وہ 1933ء کے بعد کی ہے جب احرار کی شورش سے مرعوب ہو کر اپنی جان چھڑانے کے لئے وہ اس بیان کے دینے پر مجبور ہو گئے۔ ورنہ اس سے قبل وہ احمدیت کے بڑے مداح تھے۔ چنانچہ حضرت مرزا صاحب کی وفات کے دو سال بعد علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں انہوں نے جو تقریر کی تھی اس کا ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ ”پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا جسے فرقۂ احمدیہ کہتے ہیں۔“

(ماہنامہ نگار۔ستمبر 1961ء)

میدانِ سیاست میں خدمات

پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے قبل یہ دونوں حضرات ملکی سیاست اور خاص طور پر آزادی ہند کی جنگ میں دو عظیم لیڈر بن کر اُبھرے۔ تمام تاریخ ساز مواقع پر مسلمانوں کی نظریں ان کی طرف اُٹھتی تھیں اور انگریز حکومت بھی ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ چنانچہ ان دونوں حضرات کو حکومت کی طرف سے ”سر“ کا اعزازی خطاب دیا گیا۔ یہ گویا ان کی ملک کی فلاح و بہبود کے لئے اور ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر تھا۔

گورنمنٹ برطانیہ نے برصغیر کی آزادی اور ان کے آئندہ آئینی کردار کے متعلق متواتر تین سال 1930ـ1931ـ1932 گول میز کانفرسوں کا لندن میں انعقاد کیا۔ مکرم چوہدری صاحب ان تینوں کانفرنسوں میں بطور مسلم نمائندہ شامل ہوئے۔ مکرم ڈاکٹر صاحب صرف دوسری اور تیسری کانفرنس میں شامل ہوئے۔ چوہدری صاحب نے ان کانفرنسوں میں نمائندگی کا پورا حق ادا کیا اور ان مواقع سے ملک کی آزادی کی راہ ہموار کرنے کے لئے بھر پور فائدہ اٹھایا۔

علامہ اقبال دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے لیکن اس میں ان کا کردار صرف

ایک خاموش تماشائی کا تھا۔ مصنف زندہ رود اس بارہ میں لکھتے ہیں:

''دوسری گول میز کانفرنس کے ریکارڈ سے ظاہر ہے کہ اقبال نے مباحث میں کوئی عملی حصہ نہ لیا بلکہ اقلیتی سب کمیٹی کے اجلاسوں میں خاموش بیٹھے رہے۔''

(''زندہ رود'' صفحہ 897)

علامہ کی اس کارکردگی سے نہ صرف مسلم زعماء بلکہ انگریز حکومت کو بھی مایوسی ہوئی۔ اس بناء پر علامہ کی تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت چوہدری ظفر اللہ خان کی ذاتی کوشش کے نتیجہ میں ممکن ہوسکی ورنہ حکومت ان کو شامل کرنے کے حق میں نہ تھی۔ چنانچہ جب تیسری گول میز کانفرنس کے لئے نام پیش ہوئے تو وزیر ہند نے علامہ کا نام کاٹ دیا تھا اور اس کی وجہ یہ بیان کی:

''اقبال پچھلی کانفرنس میں بالکل خاموش اور چپ چاپ تماشائی کی حیثیت سے بیٹھا رہا اور کسی بحث میں اس نے حصہ نہ لیا۔ ایسے خاموش، بے زبان اور کم سخن شخص کو دوبارہ بلانا بالکل بے کار ہے۔ ہمیں ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے جو آئین و دستور اور قانون وضع کرنے کی بحثوں میں حصہ لیں۔ اُونچ نیچ کو سمجھیں۔ ہمیں بھی سمجھائیں اور جس کانسٹی ٹیوشن کا خاکہ ہم تیار کر رہے ہیں۔ اس میں اگر ہماری راہنمائی نہیں کر سکتے تو کم از کم امداد ضرور کریں۔''

(بحوالہ سرگزشت اقبال، از عبدالسلام خورشید صفحہ 207)

مسلم لیگ کی صدارت

آزادئ ہند کی تحریک میں کانگریس پیش پیش تھی اور وہ اپنے آپ کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندہ جماعت قرار دیتی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک وقت میں بہت سے مسلم زعماء اور مسلم جماعتیں کانگریس کی ہم نوا تھیں۔ لیکن جلد مسلمانوں کے ہمدرد لیڈروں نے یہ محسوس کیا

کہ ملک کی آزادی کے بعد وہ انگریز کی غلامی سے نکل کر ہندوؤں کی غلامی میں چلے جائیں گے۔ اس غرض کے لئے حضرت قائداعظم کی قیادت میں مسلم لیگ کا احیاء ہؤا اور جلد یہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بن کر اُبھری۔ اس جماعت کے جھنڈے تلے مسلمانوں نے ایک الگ مملکت کا مطالبہ کر دیا۔ اس دور میں جن مسلم زعماء نے قائداعظم کا ساتھ دیا ان میں علامہ اقبال اور چوہدری ظفر اللہ خان بھی تھے۔ تحریک پاکستان میں انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت کی اور اسے فعال جماعت بنایا۔ چنانچہ 1931ء میں لیگ کی صدارت مکرم چوہدری صاحب نے کی اور 1932ء میں علامہ اقبال نے۔ البتہ علامہ اقبال 1940ء میں قرارداد پاکستان کے مطالبہ سے دو سال پہلے وفات پا گئے لیکن چوہدری صاحب کو خدا تعالیٰ نے لمبی زندگی عطا فرمائی وہ نہ صرف قیام پاکستان کے ابتدائی ہیرو تھے بلکہ استحکام پاکستان کے لئے ان کی خدمات غیر معمولی تھیں۔ محترم چوہدری صاحب کی پاکستان کے لئے غیر معمولی خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کو حضرت قائداعظم نے اس نئی مملکت کا پہلا وزیر خارجہ مقرر کیا اور مسلسل سات سال تک آپ نے یہ خدمت سرانجام دی اور مملکت پاکستان کا شاندار تعارف اکناف عالم میں کرایا۔

قراردادِ پاکستان

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ علامہ اقبال لاہور کے تاریخی اجلاس 1940ء میں قرارداد پاکستان کے ریزولیوشن کی منظوری سے دو سال قبل وفات پا گئے تھے، تحریک پاکستان کا علامہ کی زندگی میں نام و نشان نہیں تھا۔ اس دور میں نہ تو ابھی پاکستان کا نام تجویز ہؤا تھا اور نہ ہی مسلمانوں کی ایک الگ مملکت کے قیام کا کوئی تصور ابھرا تھا۔ اس وقت کانگریس اور مسلم لیگ دونوں ہندوستان کی آزادی کے لئے کوشاں تھیں۔ آزادی کے بعد مسلمانوں کو اپنے حقوق کے متعلق کچھ خدشات تھے۔ اس سلسلہ میں کانگریس کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے مسلمانوں کو الگ

ہونے کا خیال پیدا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے تحریک پاکستان کی صورت میں زور پکڑتا چلا گیا اور پہلی دفعہ قرارداد لاہور 1940ء میں منظور کی گئی۔ الغرض یہ حقیقت ہے کہ علامہ کی زندگی میں تحریک پاکستان کا ہرگز کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ اس لئے آج علامہ اقبال کے مداح ان کی طرف زیادہ سے زیادہ یہ بات منسوب کرنے کی جسارت کرتے ہیں کہ علامہ نے پاکستان کا خواب دیکھا تھا لیکن ایسے کسی خواب کا ذکر علامہ کے منظوم اور منثور کلام میں کسی جگہ بھی اشارۃً یا کنایۃً بھی موجود نہیں لیکن اس کے برعکس چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب کو نہ صرف تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لینے کا موقع ملا بلکہ اس مملکت کے قیام کے بعد اس کی متواتر کئی سال تک خدمت کی توفیق ملی۔ یہ مسلم قوم کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنے اس عظیم محسن کی خدمات کا بوجوہ اعتراف نہیں کرتی۔ لیکن اس تاریخی حقیقت کو زیادہ دیر تک چھپایا نہیں جا سکتا۔ حال ہی میں اس امر کا انکشاف ہوا ہے کہ تاریخی قرارداد پاکستان کے اصل مصنف سر ظفر اللہ خان ہی تھے۔ چنانچہ اسلام آباد کی مشہور یونیورسٹی آف سائنس اور ٹیکنالوجی (NUST) کے لیکچرار جناب حسین احمد صاحب نے اپنے ایک مضمون میں جو ڈیلی ٹائمز کی 22 دسمبر 2012ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے یہ تحریر کیا ہے:

> ترجمہ: ''یہ سر ظفر اللہ ہی تھے جنہوں نے قرارداد لاہور کا مسودہ تیار کیا تھا جس میں پہلی دفعہ پاکستان کا تصور پیش کیا گیا تھا۔ سر ظفر اللہ کا تعلق بہرحال ....احمدیہ فرقہ سے تھا۔ اس لئے اس سلسلہ میں ان کے کردار کو سالہا سال تک صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ یہاں تک کہ حال ہی میں لارڈ لنلتھگو کی تحریر کردہ دستاویزات اور خطوط نے سر ظفر اللہ خان کے کردار کی مرکزی حیثیت کو منکشف کر دیا ہے۔'' (ڈیلی ٹائمز 22 دسمبر 2012ء)

یاد رہے کہ ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ لنلتھگو سب سے زیادہ عرصہ یعنی 1936ء سے

1943ء تک گورنر جنرل رہے۔ واضح ہے کہ اس عرصہ میں ملک میں ہونے والے واقعات کے متعلق ان کی شہادت بہت ہی ثقہ ہے۔

خودی اور انکساری

ان دونوں حضرات کی زندگی کا ایک اہم پہلو خدا تعالیٰ کی ذات پر زندہ ایمان اور یقین سے تعلق رکھتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے ان دونوں کو بے پناہ ذہنی اور عقلی صلاحیتوں سے نوازا تھا اور اس کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ مزید خدا تعالیٰ کی طرف جھکتے اور اس کے مزید انعامات کا مورد بنتے۔ اس نقطہ نظر سے جب ہم ان دونوں حضرات کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے اپنی زندگی میں ''خودی'' کا فلسفہ اپنایا اور ہمیشہ خدا تعالیٰ سے گلے اور شکوے کا گستاخانہ لہجہ اختیار کیا اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی۔ اس بارہ میں علامہ کی شوخی ملاحظہ فرمائیں ۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خودی دراصل تکبر اور اپنے بڑے پن ہونے کا احساس ہے اور یہ وہ گناہ ہے جو کسی رنگ میں مخلوق کو زیب نہیں دیتا بلکہ خدا تعالیٰ کے غضب کو دعوت دیتا ہے اس کے مقابلہ میں عاجزی اور انکساری اور مالک حقیقی کے سامنے فروتنی سے جھکنا ہی عبادت کا لب لباب ہے۔ اس پہلو سے علامہ کی ''رموز خودی'' اور چوہدری صاحب کی ''تحدیث نعمت'' کا مطالعہ کریں تو یہ امر کھل کر سامنے آتا ہے کہ چوہدری صاحب اپنی ہر کامیابی پر خدا تعالیٰ کے حضور مزید جھکتے چلے گئے اور خدا تعالیٰ کے انعامات بارش کی طرح ان پر برستے چلے گئے۔ تمام مراتب عالیہ ان کے قدموں کے نیچے تھے۔ وہ واقعی عبدِ شکور تھے اور خدا تعالیٰ کے وعدہ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ کی زندہ تصویر تھے۔

اس کے مقابلہ میں خدا تعالیٰ نے علامہ کو جن ذہنی اور علمی صلاحیتوں سے نوازا تھا وہ اس امر کا

تقاضا کرتے تھے کہ وہ خدا تعالیٰ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے اور انکساری کا طریق اختیار کرتے لیکن خودی کا فلسفہ ان کو لے ڈوبا۔ ان کے فرزند جسٹس جاوید کی تحریر کردہ سوانح عمری ''زندہ رود'' کے مطالعہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ علامہ اپنی زندگی کے اکثر حصہ میں معاشی مشکلات سے دوچار رہے۔ اس سلسلہ میں ان کی ہر کوشش بالآخر مایوسی میں بدل جاتی۔ بعض اوقات یوں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اچھا عہدہ ان کی دسترس میں ہے اور بظاہر حالات بھی سازگار ہوتے لیکن عین وقت پر معاملہ دگرگوں ہو جاتا۔ اس کی واضح مثال 1925ء میں پنجاب میں ان کے چیف جسٹس کے تقرر کی اور 1935ء میں وائسرائے کی کونسل میں تقرر کے متعلق تھی۔ اگر ان کو ایسی کوئی سروس مل جاتی تو ان کی معاشی حالت بہتر ہو سکتی تھی اور گھر میں تنگی ترشی کا مداوا ہو سکتا تھا۔ لیکن ہر دو موقعہ پر بظاہر حالات سازگار تھے مگر معاملہ عین وقت پر بگڑ جاتا تھا۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ علامہ خدا تعالیٰ کی تائید و نصرت سے محروم تھے۔ اقبالیات کے شائقین علامہ کی اسلام سے محبت اور ان کے عشق رسول کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن جس ہستی نے ہمیں یہ نعمتیں عطا کی ہیں اس سے لاتعلقی اور بے پرواہی دونوں متناقض نظر آتی ہیں۔ اسی لئے امام زمانہ نے اس ''خودی'' کے خلاف جہاد کرنے کی دعوت دی ہے۔ فرماتے ہیں۔

یارو خودی سے باز بھی آؤ گے یا نہیں
خُو اپنی پاک صاف بناؤ گے یا نہیں

وائسرائے کونسل میں تقرر

آنریبل سر فضل حسین وائسرائے کونسل میں قریباً پندرہ برس تک ممبر رہے۔ انہوں نے نہایت کامیابی سے مسلمانوں کے حقوق کی ترجمانی کی اور اپنا نام پیدا کیا۔ 1935 میں ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد ان کے جانشین کے تقرر کے متعلق پریس میں کافی چرچا تھا اور اس غرض کے

لئے یہی دو نام یعنی ڈاکٹر محمد اقبال اور چوہدری محمد ظفر اللہ خاں بطور خاص لئے جا رہے تھے۔

قرائن سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ علامہ اقبال کا تقرر عمل میں آجائے گا۔ مسلمانوں کی طرف سے احرار اور پریس میں سے ''زمیندار'' اخبار خاص طور پر پُرزور مطالبہ کر رہے تھے۔ یہ چوہدری صاحب کے متعلق بھی پروپیگنڈہ کر رہے تھے کہ وہ چونکہ ''قادیانی'' ہیں اس لئے مسلمان ان کو اپنا نمائندہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

یہی وہ دور تھا کہ جب علامہ کسی مستقل آمد کے ذرائع کی تلاش میں تھے۔ وائسرائے کونسل میں تقرر سے ان کی مخدوش مالی حالات کا مداوا ہوسکتا تھا۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہوئی کہ حکومت ہند نے باوجود مکرم چوہدری صاحب کے بعض عذر پیش کرنے کے ان کا ہی تقرر اس عہدہ کے لئے کر دیا۔

چوہدری صاحب کا یہ تقرر علامہ کے لئے ایک عظیم ابتلاء بن گیا۔ علامہ کی اس محرومی سے احرار نے فائدہ اٹھایا اور ان کو جماعت کی مخالفت اور ان کو غیر مسلم قرار دینے کے مطالبہ پر اکسایا۔ اس پس منظر سے واضح ہے کہ 1935ء میں علامہ کی جماعت احمدیہ کی مخالفت صرف ذاتی عناد اور انتقام پر مبنی تھی۔

واضح رہے کہ علامہ یہ چاہتے تھے کہ ان کے مطالبہ کے نتیجہ میں اگر حکومت جماعت احمدیہ کو غیر مسلم مان لیتی ہے تو پھر چوہدری صاحب ایک مسلم سیٹ پر قائم نہیں رہ سکتے اور اس طرح علامہ کے تقرر کی راہ ہموار ہوسکتی تھی لیکن علامہ کی یہ خواہش اور کوشش ان کی زندگی میں نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔

علامہ نے جماعت احمدیہ کے خلاف اپنی مہم کو بظاہر مذہبی رنگ دیا اور احرار کے جماعت احمدیہ کے خلاف گھسے پٹے الزامات کو درست قرار دینے کی کوشش کی، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا علامہ کو جماعت کے افراد سے قریبی تعلقات کے دور میں وہ باتیں معلوم نہ ہوئیں اور یکدم ان کا انکشاف اس وقت ہؤا جب وائسرائے کونسل میں ان کے متوقع تقرر

کے برعکس حکومت ہند نے مکرم چوہدری صاحب کا تقرر کر دیا پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اگر علامہ کو کوئی شبہ پیدا بھی ہوا تھا تو کہیں دور جانے کی ضرورت نہ تھی بلکہ اپنے ہی گھر کے افراد یعنی اپنے بڑے قابل قدر بھائی مکرم شیخ عطا محمد صاحب اور ایک بھتیجے مکرم شیخ اعجاز احمد صاحب جو بفضلہٖ تعالیٰ کھلم کھلا احمدی تھے سے وضاحت کروا سکتے تھے۔ اس بناء پر ان کے بھتیجے مکرم شیخ اعجاز احمد صاحب کا شکوہ بجا ہے ع

کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

شاعر مشرق اور مغربی دنیا کا منفرد داعی الی اللہ

جیسا کہ شروع میں بیان کیا گیا ہے کہ ان دونوں حضرات کو ملکی سیاست میں غیر معمولی اور بنیادی خدمات سرانجام دینے کے علاوہ اپنے دائرہ کار میں کام کرنے کی وجہ سے دنیا کے مشرقی اور مغربی ممالک میں خوب شہرت ملی۔ اس لحاظ سے اگر علامہ اقبال ’’شاعرِ مشرق‘‘ بن کر اُبھرے تو دوسری طرف مکرم چوہدری صاحب نئی مملکت پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ اور بعد میں دنیا کے اُفق پر ایک غیر معمولی بین الاقوامی شخصیت بن کر اُبھرے۔ نیز اپنی ان سیاسی خدمات کے ساتھ ساتھ مغربی ممالک میں دین اسلام کی تعلیم کا فریضہ سرانجام دیا۔ اس لحاظ سے آپ مغربی دنیا میں دین اسلام کے منفرد داعی الی اللہ ٹھہرے۔

قیام پاکستان کے بعد پہلے علامہ کو ملک کا شاعر تسلیم کیا گیا۔ لیکن چونکہ آپ کا شاعرانہ کلام اردو زبان کے علاوہ فارسی زبان میں بھی ہے اس لئے ہمسایہ ملکوں میں بھی اس کو سراہا گیا اور اس بناء پر آپ کو شاعر مشرق کے لقب سے نوازا گیا۔ اس کے مقابلہ میں چوہدری صاحب کو ملکی سیاست اور وزیر خارجہ کی حیثیت سے اور بعد میں انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس اور جنرل اسمبلی کے صدر کی حیثیت سے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ مغربی ممالک میں گذارنے کا موقع ملا۔ اس عرصہ

میں آپ نے اپنی مفوضہ سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ مغرب کے لوگوں کو اسلام کا پیغام پہنچانے کے لئے قرآن مجید کا ترجمہ اس انداز میں کیا کہ مغربی ممالک میں بسنے والے لوگ قرآنی مطالب کو با آسانی سمجھ سکیں نیز حضرت بانئ اسلام سیدنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شخصیت اور مقام کو واضح کرنے کے لئے کئی کتب کے علاوہ مشہور محدث امام نووی ؒ کی مشہور تصنیف ’ریاض الصالحین‘ کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اس طرح ایک کتاب Islam And Its Meaning For The Modern Man شائع کی جو اسلام کے عقائد واعمال کی بہترین طور پر عکاسی کرتی ہے۔ نیز جہاں موقع میسر ہوا اسلام کے متعلق مضامین لکھے اور اسلام کے متعلق مغربی ممالک میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے بذریعہ مضامین اور تقاریر کوشش جاری رکھی۔ نیز اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے اپنے آپ کو کلیتًا خدمت اسلام کے لئے وقف کر دیا اور لندن مشن میں قیام کر کے انگریزی زبان میں اسلام کے متعلق لٹریچر فراہم کیا۔ ان ممالک میں نو مبائعین کی تعلیم و تربیت میں وافر حصہ لیا نیز ان ممالک میں مساجد کی تعمیر میں خاطر خواہ حصہ لیا۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت چوہدری صاحب نے مغربی ممالک میں اسلام کی تعلیم و تبلیغ اور دعوت الی اللہ کا جو سلسلہ شروع کیا وہ صرف زبانی جمع خرچ نہیں تھا بلکہ اس کے لئے انہوں نے اپنا عملی نمونہ بھی فراہم کیا۔ آپ کی بے پناہ مصروفیات پنج وقتہ نماز کی ادائیگی اور دیگر اعمال کی ادائیگی میں حائل نہ ہوئیں۔ اس کے برعکس اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ مسلم قوم میں ایک نیا اور جوش وجذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ صرف ’’گفتار کے غازی‘‘ تھے اور عملی طور پر کوئی نمونہ مسلم قوم کو فراہم نہ کر سکے۔ عملی میدان میں ان کی وہی کیفیت تھی جس کا اظہار انہوں نے اس شعر میں کیا۔

مسجد تو بنا دی پل بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا

علامہ اقبال کے خاندان میں احمدیت کا نفوذ

اس دَور میں پاکستان میں عام طور پر اور خاص طور پر جماعت احمدیہ کے خلاف اکثر حقائق کو پردہ اخفاء میں رکھنے یا بالکل تبدیل کر دینے کا مزاج ترقی پذیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کی نامور شخصیات جن کا تعلق جماعت احمدیہ کے ساتھ ہے اور جن کی ملک وقوم کے لئے خدمات غیر معمولی ہیں ان کے ذکر سے گریز کیا جاتا ہے۔ نیز اگر بعض انصاف پسند حضرات جماعت کے حق میں کوئی بات کہتے ہیں تو ان کا ذکر بالکل نہیں کیا جاتا۔ گویا تاریخی حقائق کو چھپانے یا بدلنے کا عمل برملا ہو رہا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ عمل بھی ملک میں دہشت گردی اور صحافتی بد دیانتی کا ہی نتیجہ ہے۔

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ علامہ اقبال اور ان کے خاندان کا تعلق جماعت احمدیہ کے ساتھ رہا ہے۔لیکن آج اقبالیات پر تحقیق کرنے والے اس تعلق کا قطعی طور پر ذکر نہیں کرتے یا اس کا کلی طور پر انکار کرتے ہیں ہمارا اصولی موقف یہ ہے کہ انسانی زندگی میں بعض تغیرات ہوتے رہتے ہیں لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک علامہ اقبال یا ان کے خاندان کے افراد کا تعلق جماعت احمدیہ کے ساتھ قائم رہا اس کو چھپانے یا انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر ان میں سے بعض نے بوجوہ اپنی رائے بدل لی تو اس کے ذکر میں ہرگز کوئی مضائقہ نہیں لیکن جن افراد کا تعلق تا حیات رہا ان کا ذکر محض تعصب کی بناء پر نہ کرنا انتہائی بزدلی ہے۔ اس باب میں ہم علامہ اقبال کے خاندان میں احمدیت کے نفوذ کے متعلق بعض حقائق ہدیہ قارئین کر رہے ہیں۔

علامہ اقبال کے خاندان کا تعلق شہر سیالکوٹ سے تھا۔ یہی وہ شہر ہے کہ جہاں حضرت بانیٔ جماعت احمدیہ اپنے دعویٰ سے قبل بغرض ملازمت چند سال قیام پذیر رہے۔ اسی طرح اپنے

دعویٰ کے بعد بھی متعدد بار اس شہر میں آئے۔ اس شہر اور علاقہ کے کئی بزرگ اصحاب حلقہ بگوشِ احمدیت ہوئے۔ حضور نے اپنی کتاب ضمیمہ انجام آتھم میں ان 313 خوش قسمت اصحاب کے نام تحریر کئے ہیں، جنہوں نے اوائل میں احمدیت قبول کی اور آپ سے بیعت کا شرف حاصل ہوا۔ ان میں سے کئی اصحاب کا تعلق سیالکوٹ سے تھا۔ ان میں سے ایک خوش قسمت شخص ڈاکٹر اقبال کے بڑے بھائی مکرم شیخ عطا محمد صاحب تھے جن کا نام 224 نمبر پر درج ہے۔ مکرم شیخ صاحب کی نرینہ اولاد نہ تھی چنانچہ حضور کی دعا سے ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ڈاکٹر اقبال نے اعجاز احمد رکھا یعنی یہ بیٹا حضرت احمد علیہ السلام کی دعا کا ثمرہ ہے۔

مکرم شیخ اعجاز احمد صاحب 1899ء میں پیدا ہوئے اور انہوں نے ''مظلوم اقبال'' کے نام سے کتاب تحریر کی جو 1985ء میں شائع ہوئی۔ جس میں انہوں نے علامہ اقبال اور ان کے خاندان میں احمدیت کا ذکر بھی کیا اور اس طرح اصل حقائق پیش کئے جن کو تسلیم کرنے میں کسی کو کوئی تعرض نہیں کرنا چاہئے۔

علامہ اقبال کے ایک بیٹے مکرم جسٹس جاوید اقبال صاحب جو 1924ء میں پیدا ہوئے انہوں نے اپنے والد ڈاکٹر اقبال کی زندگی کے متعلق ایک کتاب ''زندہ رود'' تین جلدوں میں شائع کی۔ تیسری جلد میں ایک باب ''اقبال اور احمدیت'' کے متعلق ہے جو زیادہ تر مکرم شیخ اعجاز احمد صاحب کا ہی تحریر کردہ ہے۔ لیکن مکرم جسٹس صاحب نے اپنے حواشی میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ علامہ اقبال اور ان کے والد اور خاندان کے افراد کا جماعت سے تعلق نہ تھا۔ واضح رہے کہ جسٹس جاوید اقبال اپنے کزن شیخ اعجاز احمد صاحب سے 25 سال چھوٹے ہیں اس لئے جن حالات کا علم مکرم شیخ اعجاز احمد صاحب کو ہوسکتا تھا وہ ہرگز مکرم جسٹس جاوید صاحب کو نہیں ہوسکتا۔ لازمی طور پر مکرم شیخ اعجاز احمد صاحب کا بیان زیادہ ثقہ اور مقدم ہونا چاہئے۔ پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جسٹس جاوید صاحب 1924ء میں پیدا ہوئے۔ جب وہ

گیارہ بارہ سال کے تھے یعنی اپنی شعور کی عمر میں قدم رکھا تھا۔ اس وقت علامہ اقبال کھلم کھلا معاندین احمدیت کے ہم نوا بن گئے تھے اور انہوں نے احمدیت کے خلاف بعض مضامین تحریر کئے۔ اس لئے ان کے ذہن پر ان حالات کا اثر غالب ہے۔ لیکن جو کچھ 1935ء سے قبل ہؤا اور گھر کے پرانے افراد جن کا احمدیت سے تعلق تھا وہ اس دنیائے فانی سے گذر چکے تھے۔ وہ حالات جسٹس صاحب کے نظر سے اوجھل تھے۔ لازمی طور پر اس دور کے حالات کے متعلق مکرم شیخ اعجاز احمد صاحب کی شہادت زیادہ وزن رکھتی ہے۔ عجیب امر یہ ہے کہ جسٹس صاحب اپنے تایا اور مکرم شیخ صاحب کے والد مکرم شیخ عطا محمد صاحب کے متعلق بھی تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ احمدی نہ تھے۔ جبکہ شیخ اعجاز احمد صاحب اپنے والد کے متعلق حتمی طور پر کہتے ہیں کہ ان کا جماعت احمدیہ سے پرانا تعلق تھا۔ (اس کی مزید تفصیل اپنے موقع پر بیان کی جائے گی) کیا بیٹے کے بیان کی موجودگی میں جسٹس صاحب کے بیان کو وقعت دی جاسکتی ہے؟

حضرت بانیٔ جماعت احمدیہ کا قبل از دعویٰ سیالکوٹ میں قیام

حضرت بانی جماعت احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد صاحب مسیح موعود و مہدی معہود علیہ السلام کا سیالکوٹ شہر سے پرانا تعلق رہا ہے۔ وہ دعویٰ سے قبل اپنی ملازمت کے سلسلہ میں وہاں قیام پذیر رہے اور پھر دعویٰ کے بعد بھی متعدد مرتبہ وہاں تشریف لے جاتے رہے۔ وہاں آپ کے مخلصین کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی بلکہ ایک موقع پر آپ نے سیالکوٹ کو اپنا وطن ثانی بیان کیا۔ اس دور کا ذکر جسٹس صاحب نے اپنی کتاب ''زندہ رود'' میں خاص طور پر کیا ہے۔ مصنف زندہ رود لکھتے ہیں:

> ''اقبال کی ولادت سے پیشتر مرزا غلام احمد سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں چار یا پانچ سال (بانی سلسلہ کا سیالکوٹ میں قیام 1864 سے 1868ء تک رہا۔ ناقل) سیالکوٹ

میں مقیم رہے۔ اس زمانہ میں وہ عیسائی مشنریوں اور آریہ سماجیوں کے اسلام پر پے در پے حملوں کا جواب دیتے اور ان سے مناظرہ کیا کرتے تھے۔ اس سبب سے ایک عالم دین کی حیثیت سے سیالکوٹ کے لوگ ان کی تعظیم کرتے تھے اور وہاں کے دیگر علماء فضلاء مثلاً مولوی غلام حسن اور مولانا سید میر حسن وغیرہ کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ جہاں تک اقبال کے والد شیخ نور محمد کا تعلق ہے۔ وہ چونکہ مولانا غلام حسن اور مولانا سید میر حسن کے خاص دوستوں اور ہم نشینوں میں سے تھے۔ اس لئے مرزا غلام احمد کو جانتے تھے.....سیالکوٹ میں مرزا غلام احمد کا قیام اقبال کے گھر کے قریب تھا۔ اس لئے اقبال انہیں گلیوں میں آتے جاتے دیکھتے تھے۔'' (زندہ رود صفحہ 573)

مکرم جسٹس صاحب نے اپنے اس بیان میں حضرت بانی جماعت احمدیہ کے اپنے سیالکوٹ میں قیام کے دوران ان کی اسلامی خدمات کو تسلیم کیا ہے۔ نیز یہ کہ ان کی نیکی اور علم کا علماء وفضلاء کو اعتراف تھا۔ اس بناء پر علامہ اقبال کے والد مکرم نور محمد صاحب بھی حضور کو بالواسطہ طور پر جانتے تھے۔ یہاں پر انہوں نے پورا حق تسلیم کرنے سے گریز کیا ہے۔ حالانکہ معاملہ صرف جاننے کی حد تک نہ تھا بلکہ علامہ کے نہ صرف والد بلکہ تمام خاندان حضرت بانیٔ جماعت احمدیہ سے محبت اور عقیدت کا تعلق رکھتا تھا۔

علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد کی بیعت

علامہ اقبال کے والد کا نام شیخ نور محمد عرف نتھو تھا۔ ان کا سن پیدائش اندازاً 1837ء ہے۔ ان کی وفات 7/اگست 1930ء میں ہوئی۔ اس طرح آپ نے 93 سال کی لمبی زندگی پائی۔ آپ ایک مذہبی انسان تھے اور اہل اللہ سے عقیدت رکھتے تھے۔ گھر اور محلہ برادری میں سب

انہیں احتراماً ''میاں جی'' کہتے تھے۔آپ چونکہ سعید الفطرت تھے اس لئے جب سیالکوٹ میں احمدیت کا شہرہ ہوا تو آپ جماعت میں شامل ہو گئے۔تاہم بعض وجوہ کی بناء پر آخر تک اس عہد کو نہ نباہ سکے۔آپ کے بڑے بیٹے شیخ عطاء محمد صاحب بھی بیعت کر چکے تھے۔آپ کے پوتے مکرم شیخ اعجاز احمد صاحب ابن شیخ عطاء محمد صاحب اپنے دادا شیخ نور محمد صاحب کے قبول احمدیت اور تمام خاندان میں احمدیت کے ساتھ جو عقیدت اور محبت کی فضا تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے خاندان کی بزرگ خواتین یعنی بے جی (والدہ علامہ اقبال) بھابی جی (میری والدہ صاحبہ) اور دونوں پھوپھیوں خصوصاً پھوپھی کریم بی بی سے سنا ہوا ہے کہ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں سلسلہ احمدیہ سے ہمارے خاندان کے گہرے تعلقات تھے۔ابا جان تو سلسلہ میں شامل ہونے والے ابتدائی حضرات میں سے تھے اور میاں جی (علامہ کے والد صاحب) بھی جماعت میں شامل ہو گئے تھے۔میاں جی کے بانیٔ سلسلہ کے پہلے جانشین حضرت مولانا حکیم نورالدین (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو) کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔یہاں تک کہ ایک مرتبہ جب ان کی اہلیہ محترمہ بھی ان کے ساتھ سیالکوٹ آئیں تو وہ ہمارے گھر ''بے جی'' کے پاس ٹھہریں۔حضرت حکیم مولانا نورالدین نے بے جی کے درد گردہ کا کامیاب علاج بھی کیا تھا۔1902ء میں جب ہماری منجھلی پھوپھی طالع بی کا انتقال ہوا تو سیالکوٹ کے احمدی حضرات ان کے جنازہ میں شامل نہ ہوئے۔اس پر ''میاں جی'' نے حضرت میر حامد صاحب جو مولانا میر حسن کے رشتہ دار اور سیالکوٹ کے احمدیوں کے سرکردہ بزرگ تھے کی زبانی حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کو پیغام بھیجا کہ میں عمر رسیدہ ہوں۔آپ کے ساتھ اس قدر تیز نہیں چل سکتا۔

برادری میں ان کے وسیع تعلقات تھے۔ انہوں نے محسوس کیا ہوگا کہ وہ غیر احمدیوں کا جنازہ نہ پڑھنے والے قاعدہ کی پابندی نہ کر سکیں گے۔ ممکن ہے انہیں اس مسئلہ پر شرح صدر بھی نہ ہو۔ اس لئے جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ان کے متعلق صرف یہی کہنا کہ وہ احمدی نہ تھے۔ نامکمل بات ہوگی۔ ہاں یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ ابتداء میں جماعت میں شامل ہو گئے تھے۔ لیکن 1902ء میں جماعت سے الگ ہو گئے۔''

(مظلوم اقبال۔صفحہ 185)

مکرم شیخ اعجاز احمد صاحب نے واشگاف الفاظ میں صحیح صورتِ حال کی وضاحت کر دی ہے۔ ان کا بیان اس لحاظ سے بھی ثقہ ہے کہ ان کو اپنے خاندان کے ابتدائی بزرگوں کو دیکھنے اور سننے کا موقع ملا تھا۔ اس کے مقابل جسٹس جاوید اقبال صاحب جو 1924ء میں پیدا ہوئے اور اپنے بھائی سے تقریباً پچیس برس چھوٹے تھے ان کو ہرگز یہ موقع میسر نہ تھا۔ نیز جب انہوں نے ہوش سنبھالا تو جماعت کے خلاف منظم مخالفت کی فضاء قائم تھی۔ اس لئے انہوں نے اس بارہ میں اپنی کتاب ''زندہ رود'' میں اپنے والد، دادا اور دیگر خاندان کے افراد کے متعلق بغیر کسی ثبوت کے ان کے احمدیت سے تعلق سے یکسر انکار کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اس بات میں کوئی صداقت نہیں کہ اقبال نے اپنی زندگی کے کسی مرحلہ پر مرزا غلام احمد کی بیعت کی یا احمدیت کے ساتھ ان کا گہرا تعلق رہا۔ اس طرح یہ کہنا درست نہیں کہ ان کے والد شیخ نور محمد احمدی تھے۔ البتہ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے اپنی زندگی کے ایک حصہ میں احمدی مسلک قبول کیا اور کچھ مدت تک جماعت میں شامل رہے مگر بقول ان کے فرزند شیخ مختار احمد اور دختران عنایت بیگم و سمینہ بیگم کے انہوں نے بعد ازاں احمدیت کو ترک کر کے جماعت سے رشتہ توڑ

دیا۔ شیخ عطا محمد اقبال کی وفات کے دو سال بعد 22 دسمبر 1940ء کو سیالکوٹ میں فوت ہوئے اور انہیں امام صاحب کے معروف قبرستان میں دفنایا گیا۔ ان کے جنازہ میں راقم بھی شریک تھا۔ نماز جنازہ شہر کے ایک سنی امام مولوی سکندر خان نے پڑھائی۔ البتہ شیخ اعجاز احمد صاحب اور ان کے چند احمدی احباب نے غالباً شیخ عطاء محمد کے گزشتہ یا مفروضہ عقیدہ کے پیش نظر علیحدہ نماز جنازہ پڑھی۔''

(زندہ رود۔جلد سوم۔صفحہ 570)

اس تحریر میں مکرم جسٹس صاحب نے گویا یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ گویا ان کے والد اور ان کے تمام خاندان کا جماعت احمدیہ سے ہرگز کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ بیان اس لحاظ سے بہت عجیب ہے کہ جبکہ ان کے تایا زاد مکرم شیخ اعجاز احمد صاحب کم از کم اپنے اور اپنے والد صاحب کے متعلق احمدی ہونے کا علی الاعلان اقرار کر رہے ہیں۔ اسی طرح اپنے دادا کے جماعت سے تعلق کی وضاحت کر رہے ہیں۔ جہاں تک ان کے والد شیخ عطا محمد صاحب اور علامہ اقبال کا جماعت سے تعلق ہے اسے ہم اگلے باب میں قدرے وضاحت سے پیش کریں گے۔ البتہ علامہ اقبال کے والد کے علاوہ ان کی والدہ اور بڑے بھائی کے جماعت سے تعلق اور بیعت کرنے کا ذکر ہے۔ اسے ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔ اس سے قارئین بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اصل صورتِ حال کیا تھی۔

علامہ اقبال کی والدہ کی عقیدت

مکرم شیخ اعجاز احمد صاحب نے علامہ کی والدہ کے متعلق یہ تحریر کیا ہے کہ ان کو حضرت بانی جماعت احمدیہ سے قلبی عقیدت اور محبت تھی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پھر یہ بھی ہمارے خاندان کی حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ سے عقیدت کا ہی اثر تھا کہ ''بے جی'' (والدہ علامہ اقبال۔ناقل) جنہیں ابا جان کے ہاں اولاد نرینہ کی بڑی

خواہش تھی، نے ابا جان سے حضرت صاحب کو دعا کے لئے خط لکھوایا کہ اللہ تعالیٰ انہیں اولاد نرینہ عطا کرے اور جب 1899ء کے شروع میں راقم الحروف (شیخ اعجاز احمد) پیدا ہوا تو چچا جان (علامہ اقبال) نے نومولود کا نام اعجاز احمد رکھا۔ ظاہر ہے علامہ مولود کو ''احمد'' کی دعاؤں کا اعجاز سمجھتے تھے۔'' (مظلوم اقبال۔صفحہ 185)

علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کی بیعت

علامہ کے بڑے بھائی مکرم شیخ عطا محمد صاحب کو بجا طور پر یہ اعزاز حاصل ہے وہ ان ابتدائی بیعت کرنے والے ان خوش قسمت 313 افراد میں سے تھے جن کے اسماء حضور علیہ السلام نے ضمیمہ انجام آتھم میں تحریر کئے ہیں۔ مکرم شیخ صاحب نے اپنے اس عہد سے کبھی انحراف نہیں کیا بلکہ خلافت ثانیہ میں تجدید بیعت بھی کی۔ جسٹس صاحب نے ان کے ایک بیٹے اور بیٹی کی طرف یہ بات منسوب کی ہے:

''کہ ابا جان نے بعد از اں احمدیت کو ترک کر کے جماعت سے رشتہ توڑ دیا۔''

اس کا جواب مکرم شیخ اعجاز احمد صاحب بڑی تحدّی کے ساتھ دیتے ہوئے لکھا:

''اس روایت کے راوی کوئی بھی ہوں اور یہ روایت بیان کرنے کی وجہ ان کی واقعات سے لاعلمی یا ان کی معاشرتی مجبوریاں اور مصلحتیں کچھ بھی ہوں، یہ روایت درست نہیں اور دستاویزی شہادت کے خلاف ہے۔ ابا جان جماعت احمدیہ میں ابتدائی شامل ہونے والوں میں تھے۔ وہ ان 313 دوستوں میں سے ہیں جن کے نام بانیٔ سلسلہ نے اپنی کتاب ''ضمیمہ انجام آتھم'' میں درج کئے ہیں ان کے کیش بکس سے حضور کا دستخطی 21 دسمبر 1907ء کا ایک مکتوب بھی حفاظت سے رکھا ہوا ملا اور حضور کی شبیہ مبارک تو وفات تک ان کے کمرے کی زینت رہی۔''

''میں خود بھی تو مرزائی ہوں''

مکرم شیخ اعجاز احمد صاحب نے اپنے والد کے احمدی ہونے کے ثبوت میں ان کے ایک خط کا چربہ بھی شائع کیا ہے۔ اس خط لکھنے کا پس منظر یہ تھا کہ مکرم شیخ عطا محمد صاحب کی بیٹی کے لئے ایک جگہ سے رشتہ آیا۔ رشتے کی خبر نکلی تو محلے کے ایک نوجوان نے علامہ اقبال کو خط لکھا کہ لڑکا کٹر مرزائی ہے۔ یہاں رشتہ نہ کیا جائے۔ علامہ نے یہ خط شیخ عطا محمد صاحب کو بھیج دیا۔ ان دنوں آپ کے بیٹے شیخ اعجاز احمد جھنگ مگھیانہ میں سب جج تھے۔ آپ نے اپنے بیٹے کو لکھا:

''میں نے اقبال کو لکھ دیا ہے کہ میں خود بھی تو مرزائی ہوں۔''

محلہ کے اس مخالف احمدیت نوجوان کے متعلق لکھا:

''بدفطرت لوگ اپنی دلی قدورت (کدورت) اکثر اس موقع پر یوں نکالا کرتے ہیں۔''

اس خط کے متعلق شیخ اعجاز احمد صاحب نے لکھا:

''میرے عزیزوں میں سے جو چاہے یہ خط دیکھ سکتا ہے۔''

گویا یہ شیخ عطا محمد صاحب کا اپنا اقبالی بیان ہے کہ وہ احمدی ہیں۔ اس کی موجودگی میں مکرم جسٹس صاحب کا کسی کے کہنے پر یہ تحریر کرنا کہ انہوں نے زندگی کے کسی موڑ پر اپنا رشتہ احمدیت سے توڑ لیا تھا کچھ وزن نہیں رکھتا۔ اس کا مزید ثبوت ان کا اپنی وفات سے چند سال قبل بیعت خلافت کا خط ہے جس کی خبر اخبار میں چھپی اور اس کی کبھی کوئی تردید نہیں کی گئی۔

شیخ عطا محمد صاحب کی بیعت خلافت

مکرم شیخ عطاء محمد صاحب تمام زندگی احمدیت سے منسلک رہے اور کبھی بھی اس رشتہ کو نہیں توڑا۔اس کا ایک ناقابل تردید ثبوت یہ ہے کہ مکرم شیخ صاحب نے اپنی وفات سے پانچ سال قبل حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے نام خط میں تجدید بیعت کی۔اس سے چند سال پہلے 1931ء میں ان کے بیٹے شیخ اعجاز احمد صاحب نے بھی بیعت کر لی تھی۔چنانچہ ان دونوں کی بیعت کی خبر روزنامہ الفضل کی 10 اپریل 1934ء کی اشاعت میں شائع شدہ ہے۔خبر کا متن یہ ہے۔

''احباب جماعت یہ سن کر خوش ہوں گے کہ تھوڑا ہی عرصہ ہوا۔جناب ڈاکٹر سر محمد اقبال کے بھتیجے جناب شیخ اعجاز احمد بی .اے سب جج نے حضرت امام جماعت احمدیہ کی بیعت کر کے جماعت احمدیہ میں داخل ہونے کا شرف حاصل کیا۔اب ان کے والد جناب شیخ عطاء محمد صاحب گورنمنٹ پنشنر سیالکوٹ نے بیعت کا حسب ذیل خط تحریر فرمایا ہے:

سیدنا حضرت امام جماعت احمدیہ!

جناب والا! کمترین حضرت بانیٔ سلسلہ کے ابتدائی زمانہ کا بیعت شدہ خدا کے فضل اور حضرت بانی سلسلہ کی دعاؤں کی برکت بیعت پر ثابت قدم ہے بلکہ بعض نشانات نے میرے ایمان کو زیادہ محکم کر دیا ہے۔چوہدری ظفر اللہ خان نے مجھے بتایا کہ خلافت کی بیعت بھی ضروری ہے۔بوجہ پیرانہ سالی و نقاہت حاضری سے مجبور ہو کر یہ عریضہ خدمت اقدس میں ارسال ہے۔براہ نوازش قدیمانہ مجھے بیعت کے سلسلہ میں لے لیویں۔میں صدق دل سے آپ کی بیعت خلافت کرتا ہوں۔

نیازمند

شیخ عطا محمد

شیخ عطا محمد صاحب کی نماز جنازہ

مکرم جسٹس صاحب نے اس بات کے ثبوت میں کہ مکرم شیخ عطا محمد صاحب نے اپنا رشتہ جماعت احمدیہ سے توڑ لیا تھا یہ امر تحریر کیا ہے کہ ان کی نماز جنازہ سیالکوٹ کے ایک سنی امام نے پڑھائی تھی۔ اس بارہ میں اصل حقیقت کیا تھی اس کی وضاحت مکرم شیخ اعجاز احمد صاحب نے یوں کی ہے:

''یہ درست ہے کہ ابا جان کے جنازہ کے ساتھ ہماری برادری کے کئی اشخاص اور ابا جان کے کئی ذاتی دوست تھے۔ جاوید کا اس وقت لڑکپن تھا اس لئے انہوں نے یہ بات نوٹ نہ کی ہو یا انہیں یاد نہ رہی ہو کہ میرے چھوٹے بھائی امتیاز مرحوم نے مجھے کہا کہ یہ لوگ ابا جان کا جنازہ پڑھنا چاہتے ہیں لیکن اپنے امام کے پیچھے۔ کیا اس میں کوئی اعتراض ہے۔ میرے نزدیک یہ کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی اور میں نے بخوشی اجازت دے دی بلکہ کہا کہ وہ لوگ پہلے جنازہ پڑھ لیں۔ بعد میں ہم پڑھ لیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔''

مکرم شیخ صاحب نے جسٹس صاحب کے اس بیان پر کہ:

''البتہ شیخ اعجاز احمد اور ان کے چند احمدی احباب نے غالباً شیخ عطا محمد کے گزشتہ یا مفروضہ عقیدے کے پیش نظر علیحدہ نماز جنازہ پڑھی۔''

کی وضاحت کرتے ہوئے مزید تحریر کیا:

''یہاں یہ غلط فہمی بھی دور کر دوں کہ احمدیوں میں جنازہ کسی کے ''گزشتہ یا مفروضہ عقیدے'' کے پیش نظر نہیں پڑھا جاتا۔''

(مظلوم اقبال صفحہ 189)

یعنی سیالکوٹ کی احمدیہ جماعت نے شیخ عطا محمد صاحب کی نماز جنازہ اس لئے پڑھی تھی چونکہ وہ احمدی تھے۔ اگر وہ احمدیت کو ترک کر چکے ہوتے تو ان کی نماز جنازہ پڑھنے کی ضرورت نہ تھی۔ جماعت میں کسی کے ''گزشتہ یا مفروضہ عقیدے'' کی بناء پر نماز جنازہ پڑھنے کا ہرگز کوئی طریق نہیں ہے۔

الغرض مکرم شیخ عطا محمد صاحب کا احمدیت سے تعلق شروع سے تھا۔ چونکہ ان کے والد بھی احمدی ہو چکے تھے اس لئے وہ ایک رنگ میں پیدائشی احمدی تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ازخود بھی بیعت کر لی تھی، اس لئے ان کا ذکر حضرت بانی ٔ جماعت احمدیہ نے ان 313 افراد میں کیا تھا جن کو آغاز میں بیعت کی توفیق ملی۔ پھر ان کے اس تعلق میں کوئی رختہ نہیں آیا۔ یہ امر سب کو بخوبی معلوم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مکرم مولانا عبدالمجید سالک صاحب نے اپنی کتاب ''ذکر اقبال''میں ان کے متعلق لکھا:

''شیخ عطا محمد نے 82 سال کی عمر پائی۔ 1940ء میں انتقال فرمایا۔ شیخ صاحب احمدی عقائد رکھتے تھے۔''

(ذکر اقبال صفحہ 9-10)

○

علامہ اقبال اور احمدیت

موافقت اور مخالفت کے ادوار کا تجزیہ

جیسا کہ گزشتہ باب میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ جسٹس جاوید اقبال صاحب نے اپنی کتاب ''زندہ رود'' میں اپنے والد اور اپنے دادا دونوں کے احمدیت سے سطحی یا گہرے تعلق کا انکار کیا ہے۔اس کے مقابلہ میں ان کے کزن جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ مکرم شیخ اعجاز صاحب نے اپنی کتاب ''مظلوم اقبال'' میں ان کے جماعت احمدیہ سے گہرے اور عقیدت مندانہ تعلقات کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔مکرم شیخ اعجاز احمد صاحب کی پیدائش 1899ء کی ہے جبکہ جسٹس جاوید اقبال صاحب 25 برس بعد 1924ء میں پیدا ہوئے اس بناء پر مکرم شیخ صاحب کو بڑا ہونے کے لحاظ سے ان کو اپنے خاندان کے افراد یعنی بزرگ مردوں اور عورتوں کو دیکھنے اور سننے کا موقعہ نصیب ہوا جو جسٹس صاحب کو ہرگز ممکن نہ تھا۔اس لئے اس بارہ میں مکرم شیخ صاحب کی شہادت زیادہ وقیع اور قابل قبول ہونی چاہئے۔

اب اس باب میں ہم خاص طور پر علامہ اقبال کی زندگی کے ہر دو ادوار کا جائزہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔جو جماعت احمدیہ کے لحاظ سے 1934ء سے پہلے اور بعد سے تعلق رکھتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ نے اپنی وفات سے تین سال قبل جماعت کی کھل کر مخالفت کی لیکن اس سے قبل انہوں نے ہمیشہ جماعت کی تعریف اور توصیف کی اور جماعت کی علمی اور عملی خدمات کا اعتراف کیا۔انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں ادوار کا کھلے دل سے اقرار کیا جائے۔اس کا اظہار محض منفی طور پر کرنا ہرگز مناسب نہیں۔

کیا علامہ اقبال پیدائشی احمدی تھے؟

حضرت بانیٔ جماعت احمدیہ اپنے دعویٰ کے بعد پہلی بار فروری 1892ء میں سیالکوٹ تشریف لے گئے۔ آپ اپنے دعویٰ سے قبل اپنی ملازمت کے سلسلہ میں سیالکوٹ میں قیام پذیر رہے تھے۔ اس زمانے کے کئی لوگ آپ کے تقویٰ وطہارت کے عینی شاہد تھے۔ جب آپ دعویٰ کے بعد وہاں گئے تو ہزاروں موافقین اور مخالفین آپ کو دیکھنے کے لئے سڑکوں پر موجود تھے۔ اس طرح آپ کا وہاں بڑا پرجوش استقبال ہوا۔

سیالکوٹ میں آپ کے قیام کے دوران کافی لوگ حلقہ بگوش احمدیت ہوئے غالباً ان میں علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد صاحب اور ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب تھے۔ ان کے قبول احمدیت کا ذکر گزشتہ باب میں ہو چکا ہے۔ اس وقت شیخ عطا محمد صاحب کی عمر تقریباً 33 برس تھی۔ اس لئے انہوں نے از خود بیعت کی تھی لیکن اس وقت علامہ اقبال کی عمر تقریباً پندرہ برس تھی اور آپ نویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ایسی عمر میں عام طور پر بچے اپنے باپ کے عقیدہ پر ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے گویا علامہ اقبال پیدائشی احمدی تھے۔ اس زمانہ میں ان کے احمدیت سے لگاؤ کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے جو ڈاکٹر بشارت احمد صاحب نے اپنی کتاب مجدد اعظم میں بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نویں جماعت میں اقبال کے ہم جماعت تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''(حضرت صاحب کے) سفر سیالکوٹ کے موقع پر اقبال جو مسجد کی ڈیوڑھی کی چھت پر چڑھے بیٹھے تھے، مجھے دیکھ کر کہنے لگے: دیکھو شمع پر کس طرح پروانے گر رہے ہیں۔''
> (مجدد اعظم جلد اول صفحہ 333)

○

بانیٔ جماعت احمدیہ کا دفاع

علامہ اقبال کا بچپن میں حضرت بانی جماعت احمدیہ علیہ السلام سے عقیدت کا ایک اور ثبوت ان کی ایک ہجویہ نظم ہے جو انہوں نے حضرت بانی جماعت احمدیہ علیہ السلام کے دفاع میں اس وقت لکھی جب وہ ایف اے کلاس کے طالب علم تھے۔ ایک شخص سعد اللہ لدھیانوی نظم اور نثر میں حضور کے خلاف نہایت گندی زبان استعمال کرتا تھا۔ چنانچہ حضور علیہ السلام اس شخص کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''اور یہ بھی یاد رہے کہ اگرچہ سعد اللہ کی نسبت میری کتابوں میں بعض سخت لفظ پاؤ گے اور تعجب کرو گے کہ اس قدر سختی اس کی نسبت کیوں اختیار کی گئی۔ مگر یہ تعجب اس وقت فی الفور دور ہو جائے گا جب اس کی گندی نظم اور نثر دیکھو گے۔ وہ بدقسمت اس قدر گندہ زبانی اور دشنام دہی میں بڑھ گیا کہ مجھے ہرگز امید نہیں کہ ابوجہل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ بدزبانی کی ہو، بلکہ میں یقیناً کہتا ہوں کہ جس قدر خدا کے نبی دنیا میں آئے ہیں ان سب کے مقابل پر کوئی ایسا گندہ زبان دشمن ثابت نہیں ہوتا جیسا کہ سعد اللہ تھا۔ اس نے مخالفت اور عناد کے کسی پہلو میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا اور چوہڑوں اور چماروں کو بھی وہ گندہ طریق گالیوں کا یاد نہیں ہوگا جو اس کو یاد تھا۔ سخت سے سخت الفاظ اور ناپاک سے ناپاک گالیاں اس شدت اور بے حیائی سے اس کے منہ سے نکلتی تھیں کہ جب تک کوئی شخص اپنی ماں کے پیٹ سے ہی بدطینت پیدا نہ ہو، ایسی فطرت کا انسان نہیں ہوسکتا۔ ایسے انسانوں سے سانپوں کے بچے بھی اچھے ہوتے ہیں۔'' (روحانی خزائن جلد 22 صفحہ 451-452)

حضور علیہ السلام کی اس تحریر سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ سعد اللہ لدھیانوی کتنا بدطینت اور

خبیث النفس شخص تھا۔ وہ حضور کے خلاف نظم ونثر میں بدزبانی کرتا تھا۔ اس موقع پر علامہ اقبال جو اس وقت ایف اے کے طالب علم تھے، انہوں نے حضور علیہ السلام کے دفاع میں سعد اللہ کے خلاف نظم میں ہی اس کا جواب دیا۔ اگرچہ یہ نظم علامہ کی کسی شائع شدہ کتاب میں درج نہیں لیکن اس زمانہ میں ''آئینہ حق نما'' میں شائع ہوئی تھی۔ بوجہ بچپن کا کلام ہونے کے ان کے کسی مجموعہ میں شامل نہ کی گئی۔ اس نظم سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اس وقت حضرت بانی جماعت احمدیہ کے خلاف بدزبانی پر خاموش نہ رہ سکے اور اس کا ترکی بہ ترکی نظم میں یوں جواب دیا۔ اس لمبی نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

واہ سعدی! دیکھ لی گندہ دہانی آپ کی
خوب ہوگی مہتروں میں قدر دانی آپ کی
بیت بازی آپ کی بیت الخلاء سے کم نہیں
ہے پسندِ خاکروباں شعر خوانی آپ کی
آپ کے اشعار موتی ہیں مگر 'ی' کے بغیر
گوشِ عالم تک یہ پہنچے ہے زبانی آپ کی
آفتابِ صدق کی گرمی سے گھبراؤ نہیں
حضرتِ شیطاں کریں گے پاسبانی آپ کی
نیلے پیلے یوں نہ ہو پھر کیا کروگے اس گھڑی
جب خبر لیوے گا قہرِ آسمانی آپ کی
قومِ عیسائی کے بھائی بن گئے پگڑی بدل
واہ کیا اسلام پر ہے مہربانی آپ کی

(شیخ محمد اقبال ایف۔اے کلاس- سکاچ مشن سکول سیالکوٹ)

ان اشعار میں علامہ نے حضرت بانیٔ سلسلہ کو'' آفتابِ صدق'' قرار دیا ہے اور سعد اللہ کے لئے'' قہرِ آسمانی'' کے نزول کا ذکر کیا ہے۔ یہ گویا حضور کی اس پیشگوئی کی طرف اشارہ تھا جس میں آپ نے سعد اللہ کی ذلت کے ساتھ موت اور ابتر رہنے کی پیشگوئی کی تھی۔ وہ واقعی حضور کی اس پیشگوئی کے مطابق قہرِ آسمانی کا نشانہ بنا اور ذلیل و نامراد ہو کر مرا۔ الغرض علامہ کی اپنے طالب علمی کے دور کی اس نظم سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی یہ ہجو یہ نظم حضور کے اس شدید معاند کے جواب میں تھی۔

○

علامہ اقبال کی حضرت بانیٔ سلسلہ سے ملاقات اور بیعت

علامہ اقبال کے بچپن کے اس واقعہ کے بعد ہم علامہ کی بلوغیت کے دور کے وہ شواہد پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ 1897ء میں جبکہ ان کی عمر بیس سال تھی اپنے دیگر دوستوں کے ہمراہ قادیان گئے اور وہاں حضورؑ کی بیعت کی۔ اس واقعہ کا ذکر ان کے ایک ساتھی مکرم بابو غلام محمد صاحب (1860-1946) یوں بیان کرتے ہیں:

''مارچ 1897ء میں ہم لاہور کے کافی نوجوانوں نے جو سارے کے سارے تعلیم یافتہ تھے اور جن کی صحیح تعداد یاد نہیں رہی، ارادہ کیا کہ حضرت مرزا صاحب کو قادیان جا کر دیکھنا چاہئے کیونکہ باہر تو انسان تصنع سے بھی بعض کام کر سکتا ہے لیکن اگر اس کے گھر میں جا کر اُسے دیکھا جائے تو اصل حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ خیر ہم حضرت اقدسؑ کے دعویٰ کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے عازم قادیان ہو گئے۔ ہم میں سے ہر شخص نے الگ الگ اعتراضات سوچ لئے تھے جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ مولوی محمد غنی صاحب خواجہ کمال الدین صاحب، ڈاکٹر محمد اقبال صاحب، مولوی غلام محی الدین صاحب قصوری، چودھری شہاب الدین صاحب، مولوی سعید الدین صاحب (بی اے ایل ایل بی) وغیرہ بھی اس قافلہ میں شامل تھے۔ خواجہ کمال الدین صاحب جو 1894ء میں بیعت کر کے سلسلہ حالیہ میں داخل ہو چکے تھے، مگر آپ چونکہ اس پارٹی اور خصوصاً مولوی محمد علی صاحب کو تبلیغ کیا کرتے تھے اس لئے آپ بھی ہمارے ساتھ گئے تھے۔ جب ہم قادیان پہنچے تو گول کمرہ میں ہمارے لئے ملاقات کا انتظام کیا گیا۔ حضور جب تشریف لائے تو آتے ہی ایک تقریر کے

رنگ میں ہمارے ایک ایک اعتراض کو لے کر اُس کا جواب دینا شروع کیا۔ حتیٰ کہ ہم سب کے اعتراضات کا مکمل جواب آ گیا۔ تب ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر تعجب کرنے لگے کہ یہ کیسے ہوُا؟ جب باہر نکلے تو بعض نے کہا کہ یہ سچ مچ مامور من اللہ ہے۔ اور بعض نے کہا یہ جادوگر ہے۔ چودھری شہاب الدین صاحب اور مولوی محمد علی صاحب وغیرہ نے کہا کہ یہ ضرور سچا ہے ہم تو بیعت کرتے ہیں۔ چنانچہ مولوی محمد علی صاحب، چوہدری سر شہاب الدین صاحب، ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب اور مولوی غلام محی الدین صاحب قصوری اور خاکسار نے بیعت کر لی۔ بعض اور لوگوں نے بھی بیعت کی تھی مگر ان کے نام مجھے یاد نہیں رہے۔ اندازاً بارہ تیرہ آدمیوں نے بیعت کی تھی۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد جب چارپائیاں تقسیم ہوئیں تو میں نے مضبوط اور بڑی چارپائی لے لی مگر چودھری شہاب الدین صاحب نے (جو بعد سر شہاب الدین کہلائے) میرا بستر ا اس سے اٹھا کر میری چارپائی پر قبضہ کر لیا۔ حضرت صاحب تشریف لائے ہر ایک سے دریافت فرمایا کہ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں، ہر شخص نے کہا کہ حضور مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ لیکن جب میرے پاس پہنچے تو میں پریشان کھڑا تھا کیونکہ میری چارپائی پر چودھری شہاب الدین صاحب قبضہ کر چکے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ حضور میری چارپائی چودھری شہاب الدین نے چھین لی ہے اور میں حیران ہوں کہ کہاں سوؤں۔ فرمایا ٹھہریے میں آپ کے لئے اور چارپائی لاتا ہوں چنانچہ حضرت صاحب تشریف لے گئے۔ مگر جب کافی دیر گزر گئی اور چارپائی نہ آئی تو میں نے حضور کے مکان کے صحن کے دروازہ سے اندر جو جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص جلدی جلدی چارپائی بُن رہا ہے اور حضور اس کے پاس

بیٹھے ہوئے دیا ہاتھ میں لے کر اُسے روشنی کر رہے ہیں۔حضور کی یہ حالت دیکھ کر مجھے بہت شرم آئی۔ میں آگے بڑھا اور عرض کی کہ حضور دیا مجھے پکڑا دیں مگر حضور نے فرمایا کہ اب تو ایک ہی پھیرا باقی ہے۔حضور کے یہ اخلاق دیکھ کر مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ میرے آنسو نکل آئے۔اس وقت میں حضور کے چہرہ مبارک کو دیکھ کر کہہ رہا تھا کہ یہ چہرہ جھوٹے شخص کا ہرگز نہیں ہوسکتا۔

اس سے پہلے جب ہم مغرب کے بعد حضور کے ساتھ کھانے پر بیٹھے تھے تو میں چونکہ حضور کے قریب تھا، حضور اُٹھاتے بٹیر اور فرماتے کہ یہ کھائیں۔دوسرا گوشت اُٹھاتے اور میرے آگے رکھ کر فرماتے کہ یہ کھائیں۔اس لئے میں حضور کے اخلاق عالیہ سے بہت ہی متاثر تھا، مگر رات چارپائی والے واقعہ کو دیکھ کر تو میں دل و جان سے حضور کا غلام بن گیا۔''

(لاہور۔تاریخ احمدیت: مؤلف شیخ عبدالقادر، سابق سوداگرمل۔صفحہ 208)

علامہ اقبال کی بیعت کی بازگشت منیر انکوائری کورٹ میں

مکرم بابو غلام محمد صاحب کے اس بیان کی تصدیق وفد کے ایک دوسرے رکن مکرم مولوی غلام محی الدین قصوری صاحب سے بھی ہوتی ہے۔اس کی تقریب یوں پیدا ہوئی کہ 1953ء میں پنجاب میں فسادات کی تحقیقاتی عدالت جو جسٹس منیر اور جسٹس ایم آر کیانی پر مشتمل تھی اس میں خواجہ نذیر احمد صاحب، چیئرمین سول اینڈ ملٹری گزٹ بورڈ آف ڈائرکٹرز نے یہ بیان ریکارڈ کروایا کہ اقبال نے 1893ء میں قادیان جاکر مولانا غلام محی الدین قصوری کے ہمراہ سلسلہ احمدیہ کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی کے ہاتھ پر بیعت کی، یعنی باقاعدہ جماعت میں شمولیت کی تھی۔

عدالت میں بیان دینے کے بعد جب خواجہ نذیر صاحب کی بار میں قصوری صاحب سے

ملاقات ہوئی تو انہوں نے بیعت کے سن کی تصحیح فرمائی اور بتایا کہ علامہ اقبال نے میرے ہمراہ جا کر 1897 میں بیعت کی تھی۔ اس پر خواجہ صاحب نے اگلے روز عدالت میں درخواست دیکر بیعت کے سن کی تصحیح کرادی چنانچہ یہ خبر پاکستان ٹائمز میں چھپی۔ اس کا اصل متن اور عنوان یوں تھا:

Iqbal was Qadiani upto 1931, Says Khawja Nazir.

"The Witness pointed out that this was a misrepresentation of his evidence in court, because he never stated that ALLAMA Iqbal was a Qadiani, but what he stated was that ALLAMA Iqbal has taken Be'at.

Khawaja Nazir Ahmad also corrected his previous Statement by Stating that ALLAMA Iqbal did not, as previously stated by the witness, take the Be'at in 1893 or 1894 but in 1897 and that the witness has been reminded of this fact by Ghulam Mohyuddin Qasuri in the Bar Room when he had a talk with the witness on this subject."

(The Pakistan Times Nov. 14, 1953)

ترجمہ: اقبال 1931ء تک قادیانی تھے۔خواجہ نذیر احمد کا بیان

گواہ نے اس امر کی نشان دہی کی کہ کورٹ میں اس کی شہادت کو غلط طور پر پیش کیا گیا ہے کیونکہ اس نے کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ علامہ اقبال قادیانی تھے بلکہ اس نے صرف یہ کہا تھا کہ انہوں نے بیعت کی تھی۔

خواجہ نذیر احمد نے پہلے بیان کی تصحیح کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ جیسا کہ گواہ کی طرف سے پہلے بیان کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال نے 1893-94 میں بیعت نہیں کی تھی بلکہ 1897 میں کی تھی اور اس بارے میں مولوی غلام محی الدین قصوری نے اس کو بار روم میں اس وقت یاد دلایا جب ان سے اس موضوع پر بات چیت ہوئی۔''

(پاکستان ٹائمز 14 نومبر 1953)

علامہ اقبال کی حضرت بانیٔ جماعت احمدیہ کے ہاتھ پر بیعت کے متعلق تصحیح مکرم مولوی غلام محی الدین قصوری صاحب نے کی جو خود اس وفد میں شامل تھے، جو قادیان گیا تھا۔ پھر خواجہ نذیر احمد صاحب نے کورٹ میں اپنے سابقہ بیان کی خود تصحیح کرائی اور یہ سب باتیں پریس میں شائع ہوئیں اور ان کی خوب تشہیر ہوئی ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں اس وقت جسٹس جاوید اقبال صاحب جو لاہور کورٹ میں خود پریکٹس کرتے تھے یا کسی ماہر اقبالیات نے اس کی کورٹ میں یا پبلک میں تردید نہ کی ۔ اس وقت تو مولوی غلام محی الدین صاحب زندہ موجود تھے جو بوقت ضرورت اپنے بیان کی مزید تفصیلات بیان کر سکتے تھے، اس وقت اس بارہ میں مکمل خاموشی اس امر کا ناقابل تردید ثبوت ہے (جس کی تائید وفد کے دیگر افراد نے بھی کی) کہ علامہ اقبال نے اس وقت وفد کے دیگر احباب کے ساتھ مل کر بیعت کی تھی۔ یہ امر سب کو معلوم ہے کہ بیعت درحقیقت جماعت میں باقاعدہ شمولیت کا طریق ہے۔

علامہ اقبال کی بیعت کی اہمیت کی اصل وجہ

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ہم علامہ اقبال کے احمدی ہونے کو اس لئے ثابت نہیں کرنا چاہتے ہیں کہ اس سے جماعت کو کچھ فائدہ مقصود ہے یا ان کے احمدی نہ ہونے سے جماعت کو کچھ نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس بارہ میں جماعت کا واضح موقف ہے کہ اگر کوئی جماعت میں شامل ہوتا ہے تو اس میں اس فرد کا اپنا فائدہ ہے۔ جماعت کو قطعاً اس کی ضرورت نہیں۔ اس بناء پر یہ حقیقت ہے کہ علامہ اقبال کے بیعت کرنے یا نہ کرنے سے جماعت کو ہرگز کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ہم اگر علامہ اقبال کی قبولیت احمدیت کا ذکر کرتے ہیں تو محض اس لئے کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور یہ ہرگز مناسب نہیں کہ تاریخی حقائق کو مسخ کیا جائے اور ان کو چھپانے کی کوشش کی جائے۔ ہمارا ادّعا یہ ہے کہ علامہ اقبال کا جماعت سے موافقت کا ایک

لمبا دور ہے جو ان کی زندگی کے 1934 تک ممتد ہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے جماعت سے تعلق قائم رکھا اور ہمیشہ جماعت کی دینی و اسلامی خدمات کو سراہا۔ وہ بیشک جماعت کے فعال ممبر نہ تھے لیکن ان کی خدمات کے معترف تھے۔ 1935ء کے بعد انہوں نے احرار کی مخالفت سے مرعوب ہو کر یا متاثر ہو کر جماعت کی علی الاعلان مخالفت شروع کر دی۔ انسانی زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ اس لئے محض عوام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اصل حقائق کو چھپانا ہرگز مناسب نہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ صحیح صورت حال پیش کی جائے۔ لوگوں کے خوف سے یا عوام کو خوش کرنے کے لئے تاریخی حقائق کو مسخ کرنا ہرگز مناسب نہیں۔

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ علامہ اقبال نے اگرچہ احمدیت کی مخالفت مذہبی بنیادوں پر کی اور جماعت کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا لیکن اگر بنظر غائر جائزہ لیا جائے یہ صرف سطحی باتیں تھیں۔ اس کی اصل وجوہ سراسر سیاسی اور کسی حد تک ذاتی پرخاش پر مبنی تھیں۔ احرار نے ان کو اپنے مذموم مقاصد کے لئے اپنا آلہ کار بنایا اور احمدیت کی مخالفت پر آمادہ کیا۔ احرار کا اصل چہرہ جلد بے نقاب ہو گیا۔ آج سب مسلمان جوان کے ماضی میں کردار سے واقف ہیں وہ ان کی مذمت کرتے ہیں۔ خود جسٹس صاحب نے اپنی کتاب میں ان کے کردار کی مذمت کی ہے اور اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ علامہ کے جماعت احمدیہ کی مخالفت کی وجوہ سیاسی تھیں۔ ایک موقع پر اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے جسٹس جاوید اقبال نے کہا:

> '' آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ایک زمانے میں علامہ اقبال نے احمدیوں کی تعریف بھی کی تھی لیکن بعد میں سیاسی وجوہ پر ان کے مخالف ہو گئے۔''

(روزنامہ پاکستان لاہور، 28 جولائی 2001)

ایک غلط خبر سے غلط نتائج کا شاہکار

مصنف زندہ رود نے اپنے اس مفروضہ کو ثابت کرنے کے لئے کہ ان کے والد کا زندگی کے کسی حصہ میں جماعت احمدیہ سے کوئی تعلق نہیں رہا، ایک معمولی صحافتی اور پروف ریڈنگ کی غلطی سے عجیب وغریب نتائج اخذ کئے ہیں۔ اصل حقیقت کو بیان کرنے سے قبل ہم مصنف کا پورا بیان اور اس سے اخذ کردہ نتائج ذیل میں درج کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''اقبال کے مخالفین کا تیسرا گروہ احمدی عقیدہ رکھنے والوں کا تھا......اقبال نے 1910ء میں اپنے ایک انگریزی خطبہ بہ عنوان ''مسلم کمیونٹی۔ ایک معاشرتی مطالعہ'' میں جو علیگڑھ میں دیا گیا ایک مقام پر قادیانی فرقہ کو پنجاب میں ''خالصتاً مسلم کردار کا طاقتور مظہر'' بیان کیا......احمدیوں نے شروع ہی سے کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح اقبال جیسی قابلیت کی حامل شخصیت کو احمدی مذہب قبول کر لینے کے لئے رضامند کیا جائے۔.... احمدیوں کے ایک اخبار نے خبر وضع کر کے شائع کردی کہ اقبال نے احمدی عقیدہ رکھنے والے کسی خاندان کی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ اس پر اقبال نے اس خبر کی تردید میں ایک بیان دیا کہ انہوں نے ایسی کوئی شادی نہیں کی بلکہ جس کسی نے یہ شادی کی ہے وہ کوئی اور اقبال ہوں گے۔.... جب احمدیوں کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی تو انہوں نے اقبال کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا۔''

(زندہ رود۔ جلد 2 صفحہ 170۔ جلد سوم صفحہ 573)

اس واقعہ کا ذکر مصنف نے اپنی کتاب کی جلد دوم اور پھر جلد سوم میں دو دفعہ کیا ہے۔ اس اخباری خبر سے آپ نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ انتہائی مضحکہ خیز ہے اور ایک صاحب عقل وفہم شخص

سے اس کی ہرگز توقع نہیں کی جاسکتی ۔ کیا کسی کے متعلق اخبار میں ایسی خبر شائع کر کے اسے جماعت میں شامل کیا جاسکتا ہے؟ پھر کون بے غیرت باپ ہے کہ جو اپنی بیٹی کی شادی کی خبر کسی ایسے شخص سے منسوب کرے جس سے رشتہ کی کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو؟

اب اس واقعہ کی حقیقت صرف اس قدر تھی کہ جماعت کے ایک اخبار الحکم کی مورخہ 28 اگست 1910ء کی اشاعت میں ایک نکاح کے اعلان کی خبر شائع ہوئی ۔ یہ نکاح حضرت امام جماعت احمدیہ حضرت مولانا نورالدینؓ کی اپنی نواسی عزیزہ امۃ الرحمن بنت مفتی فضل الرحمن کا مکرم ڈاکٹر اقبال علی کے ساتھ ہؤا تھا ۔ دولہا ایک معروف احمدی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔ لیکن جب یہ خبر اخبار میں شائع ہوئی تو اس میں ڈاکٹر اقبال علی کی بجائے ڈاکٹر محمد اقبال لکھ دیا گیا ۔ اخبارات میں ایسے ملتے جلتے ناموں کی غلطیاں عام معمول کی بات ہے ۔ لیکن مصنف نے اس رائی کو جو پہاڑ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، وہ انتہائی افسوسناک ہے ۔

یہ بات درست ہے کہ نام کے اس اشتراک سے غلط فہمی پیدا ہوئی ۔ تاہم علامہ اقبال نے خود اس کی وضاحت کر دی اور وہ اس زمانہ کے اخبار پیسہ میں یوں شائع ہوئی :

> ''اس عبارت سے میرے اکثر احباب کو غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے مجھ سے زبانی اور بذریعہ خطوط استفسار کیا ہے ۔ سب احباب کی آگاہی کے لئے بذریعہ آپ کے اخبار کے اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مجھے اس معاملہ سے کوئی سروکار نہیں ہے ۔ جن ڈاکٹر محمد اقبال کا ذکر ایڈیٹر الحکم نے کیا ہے وہ کوئی اور صاحب ہوں گے ۔''
>
> (پیسہ اخبار لاہور 15 ستمبر 1910)

علامہ کی تردید نہایت مناسب ہے ۔ انہیں یقین تھا کہ یہ غلطی محض نام کی شراکت کی بناء پر ہے ۔ ورنہ اس کے پیچھے کوئی ایسی سکیم نہ تھی جس کا افسانہ پون صدی بعد مصنف 'زندہ رود' نے عجیب مضحکہ خیز رنگ میں پیش کیا ہے ۔

ایک واضح تضاد

مصنف کی اس تحریر میں کئی تضادات ہیں جو خود اس غلطی کا واضح ثبوت ہیں۔ مصنف نے اس واقعہ سے پہلے علامہ کی علیگڑھ کی تقریر کا حوالہ دیا ہے کہ جس میں علامہ نے جماعت کو دیگر تمام اسلامی جماعتوں کے مقابلہ میں شاندار خراج تحسین پیش کیا کہ وہ '' خالصتاً مسلم کردار کا طاقتور مظہر'' ہے۔ علامہ کی یہ تقریر اسی سال یعنی دسمبر 1910ء کی ہے۔ یہ واقعہ جس کا ذکر مصنف نے کیا ہے اس تقریر سے تقریباً پانچ ماہ قبل کا ہے۔ اگر مصنف کا تجزیہ صحیح مانا جائے کہ جماعت نے علامہ کو ورغلانے کے لئے یہ غلط ہتھکنڈا استعمال کیا تھا۔ تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس واقعہ کے بعد علامہ جماعت کے اسلامی کردار کی تعریف ایسے شاندار الفاظ میں کرتے۔ یہ اندونی شہادت خود مصنف کے مفروضہ کو غلط ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ پھر اس سے مصنف کا آخری مفروضہ کہ:

> '' جب احمدیوں کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی تو انہوں نے اقبال کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا۔''

خودبخود غلط ثابت ہوجاتا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ جماعت ایک ایسے شخص کو جو ان کی برملا تعریف کر رہا ہے صرف اس وجہ سے ناپسند کرنا شروع کر دے کہ وہ ان کی جماعت میں پوری طرح پر شامل نہیں ہے۔ جماعت احمدیہ اس قسم کی غلط طریقوں پر ہرگز یقین نہیں رکھتی بلکہ اس کی مذمت کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصنف کا بیان کردہ تمام واقعہ اور اس سے اخذ کردہ تمام نتائج محض بے بنیاد اور غلط ہیں اور ہمیں حیرانگی ہے کہ جسٹس جاوید اقبال صاحب جو تعلیم یافتہ اور قانونی موشگافیوں سے واقف ہیں اپنے ایک غلط مفروضہ کو درست ثابت کرنے کے لئے ایسی متضاد باتیں بیان کریں۔

علامہ اقبال کا قادیان سے مزید لگاؤ

مصنف زندہ رود نے اگست 1910ء میں الحکم اخبار میں چھپنے والی خبر سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اس کے نتیجہ میں ایک طرف علامہ اقبال جماعت سے بدظن ہو گئے اور دوسری طرف جماعت اپنے ''منصوبہ'' کی ناکامی کے بعد اقبال کو ناپسند کرنے لگی۔ اگر مصنف زندہ رود کا یہ تجزیہ یا مفروضہ درست ہوتا تو اس کا طبعی نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ علامہ دن بدن جماعت سے دُور ہوتے چلے جاتے اور بالکل الگ ہو جاتے۔ لیکن جب ہم اس دور کے واقعات پر نظر کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کا رجحان اور لگاؤ جماعت اور اس کے مرکز قادیان سے مزید بڑھتا چلا گیا۔ اس سے قبل ہم اس واقعہ کے صرف چند ماہ بعد علامہ کے علیگڑھ کے تاریخی خطاب کا ذکر کر چکے ہیں۔ اب ہم اس واقعہ کے دو تین سال بعد کے عرصہ میں مزید دو اہم واقعات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جن سے مصنف زندہ رود کا رد ہوتا ہے اور علامہ کے قادیان کی طرف بڑھتے ہوئے رجحان کا علم ہوتا ہے۔

آفتاب اقبال کو بغرض تعلیم قادیان بھجوانا

1911ء میں علامہ اقبال نے اپنے لختِ جگر افتاب اقبال یعنی جسٹس جاوید اقبال کے بڑے بھائی کو سیالکوٹ کے سکول سے اُٹھوا کر قادیان بغرض تعلیم بھیج دیا۔

لازمی طور پر علامہ نے یہ اقدام اپنے بیٹے کے بہتر مستقبل کے لئے کیا ہوگا۔ آپ بھی چاہتے ہوں گے ان کا بیٹا اس ٹھیٹھ اسلامی نمونہ سے حصہ پا سکے جس کا ذکر انہوں نے خود برملا طور پر کیا تھا۔ علامہ کے اس عملی اقدام سے واضح ہوتا ہے کہ سید حامد شاہ صاحب کی 1902ء میں جماعت میں شمولیت کی دعوت اور پھر 1910 میں الحکم میں شادی کی خبر سے جو نتائج منصف زندہ رود نے پیش

کرنے کی کوشش کی ہے اس کا علامہ پر کوئی منفی اثر نہ تھا بلکہ آپ جماعت کی کارکردگی اور اس دور میں اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے سے پورے طور پر متفق تھے۔اسی لئے آپ نے اپنے بیٹے کی تعلیم کے لئے قادیان کا انتخاب کیا۔حیرت ہے کہ مصنف نے اس قدر اہم واقعہ کا ہرگز کوئی نوٹس نہ لیا اور صرف ان واقعات کا ذکر کیا اور ان سے وہ نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی جو دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے۔

مکرم آفتاب اقبال صاحب قادیان کے تعلیم الاسلام ہائی سکول میں تقریباً چار پانچ سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔اس دور میں ان کی قادیان میں ایک تقریر کرنے کا ذکر بھی ملتا ہے جسے جماعت کے آرگن الفضل نے شائع کیا:

> ''ڈاکٹر محمد اقبال پی ایچ ڈی مشہور شاعر کے نوجوان فرزند آفتاب اقبال جو یہاں ہائی سکول میں تعلیم پاتا ہے،حضرت مسیح موعود کی ایک نظم پڑھی پھر اپنا مضمون سنایا۔ جس میں احمدی جماعت ہی کو خدا تعالیٰ کی پاک جماعت مان کر پھر مرکز سے قطع تعلق کرنے والوں پر اظہار افسوس تھا۔'' (الفضل 31 دسمبر 1914)

یہ امر کتنا عجیب ہے کہ جسٹس صاحب نے اپنی کتاب میں اپنے بڑے بھائی کا بہت سرسری انداز میں ذکر کیا ہے اور خاص طور پر علامہ کے بیٹے کو ان کے سیالکوٹ کے مدرسہ سے ہٹوا کر قادیان بھجوانے کا ذکر بالکل نہیں کیا۔جسٹس صاحب نے خود اپنی ابتدائی تعلیم اور اس سلسلہ میں علامہ کی خصوصی توجہ کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔کیا یہی کیفیت علامہ کی اپنے بڑے بیٹے کے متعلق نہ ہوگی؟ بلکہ ہمیشہ پہلے بچہ کے متعلق والدین زیادہ جذباتی ہوتے ہیں اور خصوصی توجہ دیتے ہیں۔اتنے بڑے اہم واقعہ کا ذکر جسٹس صاحب بالکل گول کر گئے۔کیونکہ اس سے ان کے دعویٰ کی قلعی کھل جاتی ہے کہ علامہ اور ان کے خاندان کا احمدیت سے ہرگز کوئی تعلق نہیں تھا۔حقیقت یہ ہے کہ صرف اس ایک واقعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اپنے بیٹے کی تعلیم

کے لئے قادیان سے بہتر کوئی جگہ نہ پاتے تھے۔ الغرض اس سلسلہ میں جسٹس صاحب کی خاموشی معنی خیز اور افسوسناک ہے ع

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

قادیان سے فتویٰ منگوانا

علامہ کی زندگی میں اوپر کے واقعہ کے چند سال بعد ایک اور واقعہ کا ذکر ملتا ہے کہ جب انہوں نے ایک اسلامی حکم کے متعلق صحیح راہنمائی کے لئے قادیان کا رُخ کیا۔ واقعہ یوں ہؤا کہ علامہ نے لاہور کے ایک کشمیری خاندان میں نکاح کیا۔ لیکن کسی شر پسند نے اس خاتون کے متعلق گمنام خطوط بھیج کر شکوک میں مبتلا کر دیا لیکن بعد تحقیق خاتون پاکدامن معلوم ہوئیں۔ مولانا عبدالمجید سالک صاحب اس واقعہ کے متعلق اپنی کتاب ذکر اقبال میں لکھتے ہیں:

''انہیں (یعنی اقبال کو۔ ناقل) شبہ تھا کہ وہ چونکہ طلاق دینے کا ارادہ کر چکے تھے اس لئے مبادا شرعاً طلاق ہی ہو چکی ہو۔ انہوں نے مرزا جلال الدین کو مولوی حکیم نور الدین کے پاس قادیان بھیجا کہ ''مسئلہ پوچھ آؤ'' مولوی صاحب نے کہا کہ شرعاً طلاق نہیں ہوئی لیکن اگر آپ کے دل میں کوئی شبہ اور وسوسہ ہو تو دوبارہ نکاح کر لیجئے۔ چنانچہ ایک مولوی صاحب کو طلب کر کے علامہ اقبال کا نکاح اس خاتون سے دوبارہ پڑھوایا گیا۔'' (ذکر اقبال صفحہ 70)

علامہ کا لاہور اور ہندوستان کے تمام علماء اور مفتیان کرام کو چھوڑ کر اسلامی مسئلہ کے متعلق راہنمائی حاصل کرنے کے لئے اپنے ایک دوست کو قادیان بھیجنا کیا ظاہر کرتا ہے؟ یہی کہ آپ کو مکمل یقین تھا کہ اسلام کی صحیح تعلیم کا مرکز احمدیہ جماعت کا مرکز قادیان ہی ہے۔

○

علامہ اقبال کا جماعت احمدیہ کے خلاف فتویٰ تکفیر

اصل حقیقت اور پس منظر

جیسا کہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ علامہ اور ان کے تمام خاندان کا جماعت احمدیہ کے ساتھ گہرا تعلق رہا ہے۔لیکن اپنی وفات سے صرف تین سال پہلے علامہ نے یکدم جماعت کے خلاف احرار کے ہم نوا بن کر محاذ کھڑا کر دیا۔انہوں نے اخبارات میں مضامین تحریر کئے اور حکومت سے ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا۔یعنی وہی فتویٰ تکفیر جس کے وہ خود مولویوں کی طرف سے مورد رہے اور وہ ہمیشہ اس کی مذمت کرتے رہے۔اب وہی طریق انہوں نے خود اپنا لیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامہ کے اس اقدام کا کوئی مذہبی اور عقلی جواز نہ تھا۔صرف ایک قسم کی انتقامی کاروائی اور اپنی محرومی کا اظہار تھا۔نیز جس مقصد کے لئے انہوں نے جماعت کے خلاف یہ کاروائی کی اس کا کچھ فائدہ ان کو حاصل نہ ہوا۔جماعت احمدیہ کے لئے وقتی مشکلات ضرور پیدا ہوئیں لیکن بفضلہٖ تعالیٰ جماعت اس بحران سے سرخرو ہو کر نکلی۔نیز چودھری محمد ظفر اللہ خان جو اس فتویٰ کے اصل ہدف تھے وہ وائسرائے کونسل کے ممبر رہے اور خدا تعالیٰ نے ان کو قیام پاکستان اور بعد میں تمام عالم اسلام کے لئے غیر معمولی خدمات کی توفیق دی۔خدا تعالیٰ کی یہ فعلی شہادت اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ خدا تعالیٰ کی تائید و نصرت کس کو نصیب ہوئی۔

○۔ علامہ اقبال کو اپنی زندگی میں کئی مواقع پر علماء کی طرف سے کفر کے فتاویٰ کا تجربہ ہؤا۔ علماء کے اس کردار کے متعلق جسٹس جاوید نہایت افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لیکن یہ علماء کے طبقے کا اس شخص سے انتقام تھا جس نے مسلمانوں کو خودی کا

احساس دلا کر ایک قوم یا ملت کی صورت میں متحد کرنے کی جسارت کی تھی۔''

(زندہ رود۔صفحہ 612)

اس میں کوئی شک نہیں کہ تکفیر کا مذہبی حربہ علماء کا محبوب مشغلہ رہا ہے اور مسلمانوں کے تمام زعماء، مجددین اور محدثین پر یہ تیر بڑی بے دردی کے ساتھ چلایا گیا ہے۔ یہ ہماری تاریخ کا نہایت ہی افسوسناک بلکہ ہولناک پہلو ہے۔ علامہ اقبال کو بھی اپنی زندگی میں اپنے بعض خیالات یا اختلاف رائے کے اظہار پر اس کا تجربہ ہوا۔ اور اس امر کی بجا توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ خود اس کند حربہ کا استعمال ہرگز نہ کریں گے لیکن نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے ؏

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

○۔ جسٹس جاوید صاحب نے اگر علماء کی اس انتقامی کارروائی پر افسوس کا اظہار کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ افسوسناک امر ہے۔ تو کیا ان کے میزان عدل کا یہ تقاضا نہ تھا کہ وہ اپنے والد کے اس صریحاً غلط اقدام کا اعتراف کرتے، الٹا انہوں نے اس کو درست ثابت کرنے کے لئے کوشش کی ہے حالانکہ جو حربہ علامہ کے لئے غلط تھا وہ کیسے ان کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ دوسروں پر محض سنی سنائی باتوں پر اعتبار کر کے استعمال کریں۔ اس کا ہرگز کوئی جواز نہیں۔ قارئین کو ذیل کی تفصیل سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ یہ علامہ کی محض انتقامی کارروائی تھی ورنہ اس الزام میں ہرگز کچھ صداقت نہ تھی۔

○۔ علامہ اقبال نے احمدیوں کے خلاف تکفیر کا حربہ اپنی موت سے صرف تین سال قبل 1935ء میں چلایا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے اس سے قبل علامہ اپنی تمام زندگی میں جماعت احمدیہ اور اس کے بانی حضرت مرزا غلام احمد صاحب کی تعریف میں رطب اللسان رہے۔ دیکھنے والی بات یہ ہے کہ وہ کون سی ایسی بات تھی جو اس تمام عرصہ میں ان سے مخفی رہی اور یکدم ان پر ظاہر ہوئی اور اس کا فوری ردعمل وہ مضامین تھے جو علامہ نے اس عرصہ میں جماعت

احمدیہ کے خلاف تحریر کئے۔ اس کی تفصیل ہم خود جسٹس جاوید اقبال کے الفاظ میں ذیل میں درج کرتے ہیں:

''انہی ایام میں احمدیت کی تردید میں اپنا پہلا انگریزی بیان بعنوان ''قادیانیت اور صحیح العقیدہ مسلمان'' تحریر کیا۔ یہ بیان برصغیر کے مختلف انگریزی اخباروں مثلاً 'ایسٹرن ٹائمز' 'ٹربیون' 'سٹار آف انڈیا' اور کلکتہ دکن ٹائمز وغیرہ میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ اردو اخباروں میں اس کا ترجمہ بھی چھپا۔ 14 مئی 1935ء کو 'سٹیٹس مین' نے اسے شائع کیا اور ساتھ اس پر آرٹیکل لکھا جس کا عنوان تھا:

''قادیانیت اور صحیح العقیدہ مسلمان''

○۔ مختصراً اقبال کا استدلال یہ تھا کہ مسلمانوں کی ملی وحدت کی بنیادیں مذہبی تصور پر استوار ہیں، اگر ان میں کوئی ایسا گروہ پیدا ہو جو اپنی اساس ایک نئی نبوت پر رکھتے ہوئے یہ اعلان کرے کہ تمام مسلمان جو اس کا موقف قبول نہیں کرتے وہ کافر ہیں تو قدرتی طور پر ہر مسلمان ایسے گروہ کو ملت اسلامیہ کے استحکام کے لئے ایک خطرہ قرار دے گا اور یہ بات اس لئے بھی جائز ہوگی کہ مسلم معاشرہ کو ختمِ نبوت کا عقیدہ ہی سالمیت کا تحفظ فراہم کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک اس زمانہ میں اسلام میں مجوسی خیالات سے متاثر ہو کر جن دو تحریکوں نے جنم لیا، ان میں سے ایک بہائیت ہے اور دوسری قادیانیت۔ ان دو تحریکوں میں سے بہائیت اس لحاظ سے زیادہ دیانت پر مبنی ہے کہ وہ اسلام سے اعلانیہ علیحدگی کا رستہ اختیار کرتی ہے لیکن قادیانیت اسلام کے بعض اہم ظواہر کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے نصب العین سے انحراف کرتی ہے۔ اقبال کے بیان کے مطابق بروز ''حلول'' اور ''ظل'' کی اصطلاحات مسلم ایران میں منحرف تحریکوں نے اختراع کیں اور مسیح موعود کی اصطلاح بھی مسلم دینی شعور کی تخلیق

نہیں ہے۔آخر میں فرماتے ہیں کہ ہندوستان کے حاکموں کے لئے بہترین راستہ یہی ہے کہ قادیانیوں کو ایک علیحدہ مذہبی فرقہ قرار دے دیں۔''

(''اقبال کی تقریریں اور بیانات'' مرتبہ اے آر طارق صفحہ 98-91)

○۔ علامہ اقبال کے جماعت احمدیہ کے متعلق بیان پر مختلف حلقوں کی طرف سے شدید ردّعمل ہوا۔ پریس کے ایک نمائندہ نے علامہ سے پوچھا کہ انہوں نے 1911ء میں جماعت احمدیہ کے متعلق فرمایا تھا کہ ''وہ اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ ہیں'' اب ان کی رائے اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ تو انتہائی طور پر متناقض خیالات ہیں۔اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ نے اپنے بدلے ہوئے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

''یہ تقریر میں نے 1911ء یا اس سے قبل کی تھی اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ اب سے ربع صدی بیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اسے اچھی طرح پر ظاہر ہونے کے لئے برسوں چاہئیں.....ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت ....بانیٔ اسلام کی نبوت سے بھی برتر نبوت کا حتمی طور پر دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرتؐ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقص ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔''

(''احمدیت اور اسلام'' ادارہ طلوع اسلام 1958۔زندہ رود صفحہ 1078-1079)

علامہ اقبال نے ان بیانات میں جماعت احمدیہ کے خلاف جو دعاوی کئے ہیں یا ان پر جو نئے انکشافات ہوئے ہیں وہ مختصراً یہ ہیں:

1۔ بانی جماعت احمدیہ اپنی نبوت کو سیدنا آنحضرتؐ کی نبوت سے بہتر بیان کرتے ہیں۔

2۔ احمدی سیدنا آنحضرت ﷺ کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

3۔ احمدی اپنے علاوہ تمام مسلمانوں کو کافر گردانتے ہیں۔

4۔ احمدی اسلام کے بعض ظواہر کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے نصب العین سے انحراف کرتے ہیں۔

علامہ نے اپنے ان تمام دعاوی کے حق میں ایک بھی دلیل نہیں دی۔ یہ وہ الزامات ہیں جو احمدیہ جماعت کے معاندین اور حاسدین ہمیشہ سے ان کی طرف منسوب کرتے رہے ہیں اور جماعت کی طرف سے خود حضرت بانی جماعت احمدیہ کی اصل تحریرات کی روشنی میں ان کی وضاحت کی جاتی رہی ہے۔لیکن جب نیت ہی ''مخالفت برائے مخالفت'' ہوتو کبھی ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ علماء کا تو ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہے اور خود علامہ کو اس کا ذاتی تجربہ بار ہا ہو چکا تھا۔ لیکن علامہ سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ پرانے اور گھسے پٹے اعتراضات کو ''نئے انکشافات'' کا نام دیں۔ پھر اس کے اثبات کے لئے ایک بھی دلیل پیش نہ کریں۔ حد تو یہ ہے کہ بقول ان کے ان کے سامنے کسی احمدی نے سیدنا آنحضرت ﷺ کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال کئے جس سے وہ بغاوت پر اُتر آئے لیکن اس کا نام تک بیان نہیں کیا۔ کوئی احمدی ایسی لعنتی حرکت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ پھر ان کے اپنے گھر میں ان کے بڑے بھائی تھے جو ان کے محسن تھے۔ ان کے بھتیجے مکرم شیخ اعجاز احمد صاحب تھے جن کو وہ ''صالح آدمی'' بیان کرتے ہیں۔ ان سے ہی اس کا ذکر کر کے اس کی تصدیق کروا سکتے تھے۔ بڑی آسانی سے ان کو تمام حقیقت حال معلوم ہو جاتی لیکن یہ تو تبھی ممکن تھا جب وہ دیانتداری سے معاملہ کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ورنہ اگر بوجوہ وہ

مخالفت پر اُدھار کھائے بیٹھے ہوں تو پھر کوئی بہانہ درکار تھا۔

○۔ اس کے علاوہ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ ان مخالفانہ بیانات سے قبل علامہ کے تقریباً ربع صدی سے زائد عرصہ جماعت احمدیہ کے ساتھ بہت قریبی تعلقات تھے۔ خود جسٹس جاوید صاحب ان کا ذکر کرتے ہوئے علامہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''کئی احمدی (قادیانی پارٹی اور لاہور پارٹی کے) ان کے قریبی دوست رہے۔ وہ ان کے ساتھ جلسوں میں شریک ہوتے اور ان کے ساتھ مل جل کر علمی یا ملکی مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے تھے۔''

(زندہ رود۔ صفحہ 1115)

○۔ کیا یہ عجیب امر نہیں کہ علامہ کو اپنے ایسے قریبی دوست جن کے ساتھ ان کے سالہا سال سے تعلقات قائم تھے۔ یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ ان کے سیدنا آنحضرت ﷺ کے متعلق کیا خیالات ہیں۔ ایک طرف تو ہم ان کو ''مفکر'' اور ''دانشور'' قرار دیتے ہیں دوسری طرف ان کی بے خبری کا یہ عالم کہ ان کو یہ معمولی بات بھی معلوم نہ ہو سکی۔ کسی کے ذہن میں یہ بات آ سکتی ہے کہ شائد احمدیوں نے اپنے عقائد میں تبدیلی کر لی ہو۔ لیکن اس کا بھی ہرگز کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ احمدیوں نے 1935ء میں نئے عقائد اپنا لئے تھے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ حضرت بانیٔ جماعت احمدیہ جو 1908ء میں وفات پا گئے۔ ان کے مخالفین ان پر اس قسم کے الزامات ہمیشہ لگاتے رہے۔ جن کی تردید وہ خود بھی کرتے رہے اور جماعت کے علماء بھی دلائل کے ساتھ وضاحت کرتے رہے۔ علامہ کے ان الزامات کو کسی بھی نقطہ نظر سے دیکھا جائے وہ انتہائی طور پر غلط اور بے بنیاد تھے۔ ان کا سہارا لے کر جماعت کو غیر مسلم قرار دینے کا انگریز حکومت سے مطالبہ صرف مضحکہ خیز تھا۔ اس لئے اس کی کچھ شنوائی نہ ہوئی ۔ علامہ کا یہ خیال کہ وہ اپنی مسلمانوں میں مقبولیت کی بناء پر حکومت سے یہ ظالمانہ فیصلہ کروا سکیں گے۔ غلط ثابت ہوا۔ نیز

جس مقصد کے لئے انہوں نے یہ پینترا بدلہ اس میں ان کو ذرا برابر بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

○۔ مذکورہ بالا حالات کے پیش نظر دیکھا جائے تو صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جماعت احمدیہ کے خلاف 1935ء میں علامہ کے الزامات کسی ''نئی تحقیق'' پر مبنی نہ تھے نہ ہی وہ کوئی ''نیا انکشاف'' تھا بلکہ محض معاندین احمدیت کے بے سروپا الزامات کی بازگشت تھی اور اس کے پیچھے بعض ذاتی اغراض کی تکمیل تھی۔ چنانچہ خود ان کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد صاحب نے ان سے پردہ اٹھایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''سلسلہ احمدیہ کے خلاف 1935ء کے بیانات میں اتنی شدت اور تلخی شاید نہ ہوتی اگر ایک ذاتی معاملہ میں ان کا احساس محرومی کارفرما نہ ہوتا اور اس مرتبہ تو ان کے احساس ناکامی کے شدید ہونے کی وجہ بھی تھی کیونکہ 'دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا' والا معاملہ ہوا تھا۔

1932ء میں سر فضل حسین وائسرائے کونسل ہند کے رکن چار ماہ کی رخصت پر گئے ان کی جگہ علامہ کے تقرر کا ذکر اخبارات میں آیا لیکن وزیر ہند نے چوہدری محمد ظفر اللہ خان کو مقرر کردیا۔ سر فضل حسین کی تقرری کی معیاد اپریل 1935ء میں ختم ہونے والی تھی۔ ان کی جگہ کون لے گا، اس کے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں چونکہ چوہدری ظفر اللہ خان عارضی طور پر چار ماہ ان کی جگہ کام کر چکے تھے۔ اس لئے ان کا نام بھی مستقل تقرری کے سلسلہ میں لیا جا رہا تھا۔ ان کی تقرری کے خلاف احراریوں اور روزنامہ '' زمیندار'' نے زبردست پروپیگنڈا شروع کر رکھا تھا۔ ''زمیندار'' نے ایک کھلا خط زیر عنوان ''مکتوبِ مفتوح بنام نائب السلطنت کشورِ ہند'' شائع کیا جس میں لکھا تھا کہ:

چوہدری ظفر اللہ خان قادیانی ہیں اور قادیانیت ہرگز اسلام کا کوئی فرقہ نہیں بلکہ

بالکل علیحدہ مذہب ہے اس لئے سر فضل حسین کی جگہ ان کو نہ مقرر کیا جائے بلکہ اور کسی ایسے جلیل القدر مسلمان کو یہ منصب رفیع سپرد کیا جائے جو مسلمانان ہند کے اعتماد کا حامل ہو۔ (مراد علامہ اقبال سے تھی۔ ناقل)

(زندہ رود جلد سوم صفحہ 598)

اس ضمن میں علامہ اقبال کا نام بھی لیا جا رہا تھا۔

''آخر کار اکتوبر 1934ء میں چوہدری ظفر اللہ خان کے تقرر کا اعلان ہو گیا اور مئی 1935ء میں انہوں نے چارج بھی لے لیا۔ پھر کیا تھا، احراریوں اور علامہ کے حاشیہ نشینوں کو علامہ کو بھڑکانے کا اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ چوہدری ظفر اللہ خاں کا تقرر وزیر ہند نے کیا۔ اس میں جماعت احمدیہ کا کوئی ہاتھ نہ تھا لیکن نزلہ عضوِ ضعیف پر گرا۔'' (مظلوم اقبال صفحہ 206-207)

○۔ گویا جماعت احمدیہ کے خلاف علامہ کی مخالفت کی ایک وجہ ان ایام میں احرار کی پہلی منظم تحریک تھی۔ لیکن اس کے علاوہ دوسری اہم وجہ جو مکرم شیخ اعجاز احمد صاحب نے بیان کی ہے وہ ان کی مالی مشکلات تھیں۔ علامہ کو توقع تھی کہ وائسرائے کونسل میں ان کے تقرر سے ان مشکلات کا حل نکل آئے گا۔ قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کا تقرر ناگزیر تھا لیکن ان کی شومیٔ قسمت یہ قرعہ چوہدری ظفر اللہ خان کے نام نکل آیا۔ بس پھر کیا تھا کہ علامہ انتقامی کاروائی پر اُتر آئے اور جماعت احمدیہ کی مخالفت میں مضامین اور بیانات دیکر حکومت سے احمدیوں کے غیر مسلم اقلیت کا مطالبہ کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ وائسرائے کونسل میں ایک مسلم سیٹ پر ایک ''غیر مسلم'' کا تقرر کر دیا گیا ہے۔ علامہ کو امید تھی کہ حکومت ان کی مسلمانوں میں مقبولیت کے پیش نظر اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرے گی اور ان کا تقرر ممکن ہو سکے گا۔ لیکن نوشتہ تقدیر نہ ٹل سکا اور ؏

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مکرم شیخ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

'' قدرت کی نعمتوں کی تقسیم میں ایک طرح کا توازن کارفرما معلوم ہوتا ہے علامہ اقبال کو اللہ تعالیٰ نے اور تو کئی نعمتوں سے نوازا ہوا تھا۔لیکن مالی فراغت اور آسودگی کبھی نصیب نہ ہوئی زندگی کے آخری آٹھ دس سالوں میں کچھ تو ان کی علالت کے باعث اور کچھ سیاست میں پڑ جانے کی وجہ سے آمدنی اور بھی محدود ہوگئی۔بس لشتم پشتم گذر رہوتی تھی۔تلی میں آیا گلی میں کھایا والا حال تھا۔وہ خود تو بڑے قناعت پسند تھے اور '' تہی کیسہ و خورسند '' رہنے والے تھے لیکن آٹے دال کا بھاؤ تو گھر داری کا انتظام کرنے والی خاتون خانہ کو معلوم ہوتا ہے۔وہ گاہے گاہے ان سے اس بات پر الجھتی رہتی تھیں کہ یا تو ڈھنگ سے وکالت کریں یا کہیں ملازمت کرلیں۔علامہ دل سے ملازمت کو پسند نہ کرتے تھے لیکن حالات سے مجبور ہوکر وہ چاہتے تھے کہ اگر کوئی مناسب انتظام ہو سکے تو ملازمت کرلیں۔لیکن کوئی مناسب انتظام نہ ہوسکا۔''

(مظلوم اقبال۔صفحہ 208)

مکرم شیخ صاحب کے نزدیک علامہ کو ایک باعزت ملازمت کی صورت نظر آرہی تھی اور بظاہر تمام حالات بھی سازگار تھے لیکن سب بنا بنایا کھیل بگڑ گیا اور علامہ کے لئے سوائے صدائے احتجاج بلند کرنے کے اور اپنا غیظ و غضب کے اظہار کرنے کے کوئی صورت نظر نہ آئی۔گویا علامہ کا 1935ء میں احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ محض ذاتی محرومی اور پرخاش پر مبنی تھا، ورنہ اس سے قبل ساری زندگی وہ احمدیوں کو دائرہ اسلام سے خارج نہ سمجھتے تھے بلکہ باقی مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کو مثالی اور عملی ٹھیٹھ مسلمان گردانتے تھے۔

الغرض علامہ نے جن حالات میں جماعت احمدیہ کے خلاف کفر کا فتویٰ لگایا۔اب ان کے صاحبزادہ اور اقبالیات کے ماہرین کچھ بھی تاویل پیش کرنے کی کوشش کریں اور جماعت احمدیہ پر بدستور ختمِ نبوت کے انکار کی تہمت تھوپتے چلے جائیں، لیکن ہر ذی فہم جس کی 1935ء کے حالات پر گہری نظر ہے وہ وہی نتیجہ اخذ کرے گا جو علامہ کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد صاحب نے کیا چنانچہ ان کے معاصر مکرم مولانا عبد المجید سالک صاحب اپنی کتاب ذکر اقبال میں اس کی وجہ بھی وہی بیان کرتے ہیں جس کی نشاندہی مکرم شیخ صاحب نے کی۔وہ لکھتے ہیں:

''1935ء میں مولانا ظفر علی خان اور مجلس احرار نے احمدیت اور احمدیوں کے خلاف ایک عام تحریک کا آغاز کیا... خدا جانے علامہ اقبال نے کسی عقیدت مند کی درخواست پر ایک مضمون لکھا جس میں بتایا کہ اس فرقہ کی بنیاد ہی غلطی پر ہے...اور آخر میں حکومت کو یہ مشورہ دیا کہ اس فرقہ کو ایک علیحدہ جماعت تسلیم کرے۔''

(ذکر اقبال صفحہ 210)

الغرض علامہ نے 1935ء میں جن حالات میں جماعت احمدیہ کے خلاف مضامین کا سلسلہ شروع کیا اور ان کی تکفیر کی مہم چلائی وہ تاریخ کا ایک کھلم کھلا ورق ہے۔اسے کسی صورت میں نہ جھٹلایا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس پر پردہ ڈالا جاسکتا۔آج اگر جماعت احمدیہ کی اندھی مخالفت میں ان حقائق کو مسخ کیا جارہا ہے تو وہ دن دور نہیں کہ مخالفت کے بادل چھٹنے کے بعد اصل حقیقت کا لازمی طور پر اعتراف کرنا ہوگا۔

آخر میں ہم ناموافقین سے یہ ضرور دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر علّامہ کی عالمِ اسلام کو بیدار اور متحد کرنے کی خدمات کا صِلہ ان کے نزدیک علما نے علّامہ کے خلاف کفر کے فتویٰ کی صورت میں دیا اور ان کی اس نیکی کا یوں انتقام لیا تو بعینہٖ ہم ناموافقین سے یہ سوال کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ کیا چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب کی پاکستان اور تمام عالمِ اسلام کے لئے

وہ خدمات جن کا خاص طور پر بانیٔ پاکستان حضرت قائداعظم اور تمام اسلامی مملک کے عمائدین نے برملا اعتراف کیا تھا، اس کا یہی صلہ بنتا ہے کہ ان کی تکفیر کی جائے؟ کیا اس انتقامی کارروائی کا کوئی جواز بنتا ہے؟ ناموافقین کو کم از کم اس جرأت کا ثبوت دینا چاہیئے کہ اگر علّامہ کے خلاف علماء کا انتقام غلط تھا تو حضرت چوہدری صاحب کے خلاف اس انتقام کا کیا جواز ہے؟ اب عدل کا ترازو ناموافقین کے ہاتھ میں ہے، دیکھتے ہیں کہ وہ کیا فیصلہ کرتے ہیں۔

○

عقیدہ ختمِ نبوت اور علامہ اقبال

ختمِ نبوت کی عجیب و غریب تاویل

ہم گذشتہ باب میں علامہ اقبال کی جماعت احمدیہ کی مخالفت اور تکفیر کے حقیقی اسباب کا جائزہ پیش کر چکے ہیں۔ علامہ کی اس مخالفت کی وجوہ علمی یا اعتقادی نہ تھیں بلکہ ذاتی اور اقتصادی تھیں۔ تاہم انہوں نے جماعت احمدیہ پر ختمِ نبوت کے انکار کا الزام بھی عائد کیا ہے۔ جماعت پر یہ الزام محض دھاندلی سے لگایا جاتا ہے اور جماعت احمدیہ اس کی بارہا تردید کر چکی ہے۔ واضح ہے کہ قرآن مجید میں سیدنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین قرار دیا گیا ہے۔ اور ہر احمدی قرآن مجید کی ہر آیت بلکہ ہر لفظ کو الہامی مانتا ہے۔ اس لئے اس کے انکار کا ہرگز سوال پیدا نہیں ہوتا۔

البتہ خاتم النبیین کی تشریح و تاویل میں علماء اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ جماعت احمدیہ بھی اس کے معنوں کے متعلق ایک اپنی رائے رکھتی ہے۔ اختلاف رائے کو انکار سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر تشریح و تاویل میں اختلاف کو انکار قرار دیا جائے تو پھر علامہ اقبال خود ختمِ نبوت کے منکر قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ ہم اس باب میں علامہ کی ختمِ نبوت کے متعلق عجیب و غریب تاویل کو پیش کرتے ہیں جو خود دوسرے علماء کو ہرگز قابل قبول نہیں۔ اس لحاظ سے اگر وہ جماعت احمدیہ کو منکر ختمِ نبوت قرار دیتے ہیں تو پھر یہی الزام ان پر بھی عائد ہو سکتا ہے۔

سیدنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختمِ نبوت پر ایمان تمام مسلمانوں کے ایمان کا ایک لازمی حصہ ہے لیکن ختمِ نبوت کی تاویل و تشریح میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن مجید میں خاتم النبیین قرار دیا گیا ہے اس لئے

آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آ سکتا، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ آخری زمانہ میں مسیح ناصری امت محمدیہ کی اصلاح کے لئے نازل ہوں گے۔ چونکہ وہ امتی بن کر اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کی خدمت کے لئے مبعوث ہوں گے اس لئے ختم نبوت متاثر نہ ہوگی اس بناء پر امت کے کئی بزرگان نے ایسی نبوت کو جائز قرار دیا ہے۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاں امت محمدیہ میں مسیح ومہدی کے نزول کی پیشگوئی فرمائی ہے وہاں اس کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی:

لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ إِلاَّ الْمُبَشِّرَاتُ

یعنی خدا تعالیٰ نے مکالمہ ومخاطبہ جو نبوت کا ہی ایک جزو ہے اسے ہمیشہ کے لئے جاری رکھا ہے۔ شرعی نبوت کے علاوہ دیگر روحانی ذرائع جن میں رویائے صادقہ اور غیر شرعی وحی والہام شامل ہیں وہ بند نہیں ہوئے۔ چنانچہ امت کے بے شمار بزرگان اور مجددین ومصلحین نے ان روحانی برکات سے وافر حصہ لیا ہے۔

علماء سلف اور حاضر کی ختم نبوت کے متعلق مختلف تاویلات کے برعکس علامہ اقبال نے مقام ختم نبوت کی ایک ایسی تاویل پیش کی ہے جو سراسر مغربی اور مادی تعلیم کا نتیجہ ہے اور اس کا اسلام کی روحانی اقدار سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ علامہ کے نزدیک سیدنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مقام ختم نبوت پر فائز کر کے خدا تعالیٰ نے دنیا کو یہ پیغام دیا ہے کہ اب دنیا اپنے عقلی بلوغت کے دور تک پہنچ گئی ہے اب اسے آئندہ کسی الٰہی ہدایت کی ضرورت نہیں۔ ماضی میں انسان کی جب تک عقلی استعدادیں تدریجی ترقی کے عمل سے گذر رہی تھیں ان کو الٰہی ہدایت کی ضرورت تھی اور اس غرض کے لئے انبیاء مبعوث ہوتے رہے۔ اب چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے زمانہ میں انسان اپنی عقل وفہم کے تمام زینے طے کر چکا ہے اس لئے خدا تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کا عمل ختم کر دیا ہے۔ گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین قرار دیکر خدا تعالیٰ نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ اب خالق ومخلوق کے درمیان وحی والہام کا یہ واسطہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا ہے۔ اب انسان

اپنی عقل وفہم اور اجتہاد سے اپنے مسائل خود حل کر سکتا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنا یہ نظریہ پہلی دفعہ علیگڑھ میں 1930ء میں پیش کیا۔ وہاں آپ نے انگریزی میں متعدد مقالات پڑھے جن کا اُردو ترجمہ ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے عنوان سے علامہ کی وفات کے بیس سال بعد شائع ہوا۔ چنانچہ اپنے پانچویں مقالہ بعنوان ''اسلامی ثقافت کی روح''میں مقامِ ختمِ نبوت کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

''اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یوں نظر آئے گا جیسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی جو دُنیائے قدیم وجدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے باعتبار اپنے سر چشمہ وحی کے آپ کا تعلق دنیا قدیم سے ہے لیکن باعتبار اس کی روح کے دنیا جدید سے۔ یہ آپ ہی کا وجود ہے کہ زندگی بھر علم وحکمت کے وہ تازہ چشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ کے رُخ کے عین مطابق تھے۔ لہٰذا اسلام کا ظہور استقرائی عقل کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت چونکہ اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کی شعور ذات کی تکمیل ہوگی تو یوں ہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اگر دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا یا موروثی بادشاہت کو جائز نہ رکھا یا بار بار عقل وتجربے پر زور دیا یا عالم فطرت یا عالم تاریخ کو علم انسان کا سر چشمہ ٹھہرایا اس لئے کہ ان سب کے اندر یہی نکتہ مضمر ہے۔ چونکہ یہ سب تصور خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں۔''

(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ صفحہ 193-94۔ زندہ رود صفحہ 167-168)

علامہ اقبال کے ختمِ نبوت کے متعلق اس نظریہ کی اقبال اکیڈمی کے سکالر ڈاکٹر اشرف صاحب یوں وضاحت بیان فرماتے ہیں:

''اقبال کے نزدیک نبی پاک کی ذات سے تاریخ انسانی دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ایک سلسلہ نبوت سے قبل کی دنیا اور ایک سلسلہ نبوت کے بعد کی دنیا۔نبوت کا خاتمہ ہوگیا۔''

علامہ اقبال کے اس نظریہ کی علامہ اقبال اکیڈمی کے سکالرز نے جو تشریح پیش کی ہے وہ عام علماء کے نظریہ ختمِ نبوت سے بالکل مختلف ہے۔چنانچہ مکرم عبدالقیوم صاحب اپنے مقالہ میں بیان کرتے ہیں:

''اقبال کی نظر میں عقیدہ ختمِ نبوت کا مطلب یہ ہے کہ اب کسی شخص کو اس دعویٰ کا حق نہیں کہ اس کے علم کا تعلق کسی مافوق الفطرت سرچشمے سے ہے۔لہٰذا ہمیں اس کی اطاعت لازم آتی ہے۔مطلب یہ کہ انسانی زندگی ارتقاء کی اس سطح تک پہنچ گئی ہے۔جہاں انسان اپنی عقل اور مشاہدے سے حاصل شدہ علم اور شعور کی روشنی میں اپنی زندگی کا نصب العین متعین کرسکتا ہے اور اس کے حصول کے لئے اپنی عقل اور مشاہدہ کو بروئے کار لاکر اپنے اصول بھی وضع کرسکتا ہے۔اب اسے اپنے بیرون کسی مافوق الفطرت ہستی کا دستِ نگر نہیں ہونا پڑے گا.....دوسرے الفاظ میں اب انسانی زندگی کی ہدایت کے لئے وحی کی جگہ انسانی عقل و مشاہدے نے لے لی ہے۔''

(خطبات بریاد اقبال جون 1944،شائع کردہ ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب)

علامہ کے اس نظریہ ختمِ نبوت کی مکرم نذیر نیازی صاحب یوں وضاحت کرتے ہیں:

''اب نہ کسی کتاب کی ضرورت ہے، نہ رسول کی، نہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کی، نہ کشف و الہام کی، نہ ایسا دعویٰ حجت ہے کہ اُمت اس کی تائید و تصدیق پر شرعاً مکلف ہو۔'' (اقبال کے حضور صفحہ 250 مطبوعہ اقبال اکاڈمی، کراچی 1971)

ختمِ نبوت کے متعلق علامہ کا یہ نظریہ سنی اور شیعہ اور دیگر اسلامی مکاتب فکر کے بھی خلاف ہے کیونکہ یہ سب سیدنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی اور نبی کی آمد کے تو خلاف ہیں لیکن اس سے کم تر روحانی برکات اور مبشرات کو ختم نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک ایسے امام خواہ وہ مہدی ہوں یا امام غائب ہوں وہ ختم نہیں ہوئے بلکہ جیسا کہ ہم دوسری جگہ وضاحت سے بیان کریں گے علامہ بھی ایک وقت میں ایسے امام کی آمد کو ضروری سمجھتے تھے اور اس کی آمد کے منتظر تھے۔

علامہ کے نظریہ کو ماننے کا طبعی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلام، قرآن کریم اور سیدنا آنحضرت صلعم کی متابعت سے کوئی روحانی برکت حاصل نہیں ہوسکتی کیونکہ اب آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے یہ سب روحانی برکات ختم کر دی گئی ہیں۔ اب انسان بلوغت کے اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ وہ اپنی ہدایت کے لئے اپنی عقل اور مشاہدے سے خود راستہ تجویز کرسکتا ہے۔

اگر علامہ کا یہ نظریہ درست مان لیا جائے تو پھر طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مسلمان بقول اقبال مثیل یہود اور ہنود بن چکے تھے جیسا کہ وہ کہتے ہیں ۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں! جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود

(بانگ درا)

تو پھر ان کی اصلاح کے لئے کیوں صاحبان ذی علم وشعور میں سے کوئی ایسا پیدا نہ ہوا جو مسیح اور کرشن کا کردار ادا کرسکتا اور دوبارہ مسلمانوں کو راہ راست پر لاسکتا۔ گویا مسلمان اپنی بے راہ روی اور ضلالت میں اپنی انتہا تک پہنچ چکے تھے۔ مگر اس کا کوئی علاج میسر نہیں تھا۔ خود علامہ کو بھی اس کا احساس تھا۔ تبھی تو انہوں نے یہ کہا:

ہے دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے

مولانا حالی اور خود علامہ مسلمانوں کی اس حالت کی مرثیہ خوانی کرتے رہے اور خدا تعالیٰ

سے شکوہ کرتے رہے لیکن علامہ کے نظریہ ختمِ نبوت کے مطابق کوئی ایسا ''عبد'' اور ''کامل انسان'' پیدا نہ ہوا جو ان کی اصلاح کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّ عَلَیۡنَا لَلۡھُدٰی یعنی ہدایت خدا تعالیٰ ہی نصیب کرتا ہے یہ کام کسی عالم اور عاقل کا نہیں کہ وہ لوگوں کو ہدایت دے سکے۔ لوگوں کو ہدایت وہی دے سکتا ہے اور لوگوں کا رخ خدا تعالیٰ کی طرف وہی موڑ سکتا ہے جو خود خدا تعالیٰ کی طرف سے آیا ہو۔

علامہ اقبال کے نظریہ پر مولانا مودودی کی تنقید

علامہ اقبال کے ختمِ نبوت کے متعلق اس عجیب نظریہ کو مولانا مودودی نے اپنے ماہنامہ میں بھی شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ یہ نظریہ اسلام کی بنیادی جڑ کاٹنے والا ہے۔ انہوں نے پہلے علامہ کے اس نظریہ کا خلاصہ یوں بیان کیا ہے:

> ''تاریخ انسانی دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا دور جو خاتم النبیین کی بعثت سے پہلے گذرا۔ دوسرا وہ جو حضور کی بعثت کے بعد شروع ہوا۔ پہلے کو عہد طفولت اور دوسرے کو عہد شباب کہا گیا ہے چونکہ انسانی ذہن، سن شعور کو پہنچ گیا اس لئے اب اس کی وقتاً فوقتاً راہنمائی کے لئے آئندہ مزید انبیاء کی ضرورت نہیں۔''

اس نظریہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

> ''ہمارے نزدیک ختمِ نبوت کے لئے یہ استدلال اپنے مقدمات کے لحاظ سے بھی غلط ہے اور نتیجہ کے اعتبار سے بھی۔ انسانی ذہن کا ارتقاء جس پر اس پورے استدلال کی بنیاد رکھی گئی ہے صرف عالم زمانی، مادی و طبعی معلومات تک محدود ہے۔ رہا دینی و اخلاقی شعور تو اس معاملہ میں ذہن انسانی کا ارتقاء کوئی ثابت شدہ حقیقت نہیں ہے۔ آغاز انسانیت سے لے کر آج تک پاکیزہ ترین تصور ایمان و اخلاق

رکھنے والے انسان اور بدترین عقائد و اخلاق رکھنے والے انسان ہر دور اور ہر زمانے میں پہلو بہ پہلو پائے گئے ہیں۔نوع انسانی نے تاریخ و زمانی تدریج کے لحاظ سے اخلاق و ایمان میں ترقی کے کوئی مدارج طے نہیں کئے ہیں۔ دیدہ روزگار نے ہر زمانے میں عقیدہ واخلاق کی انتہائی بلندی اور انتہائی پستی کے مناظر کا مشاہدہ کیا ہے۔اس لئے ختمِ نبوت کے حق میں یہ دلیل سرے سے غلط ہے۔اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ قادیانیت کے ساتھ ساتھ اسلام کی بھی جڑ کاٹ دیتا ہے۔اگر ہم یہ مان لیں کہ پہلے انبیاء کی ضرورت اس لئے تھی کہ انسان بچہ تھا اور اب ان کی ضرورت اس لئے نہیں کہ اب انسان سن شعور کو پہنچ چکا ہے تو اس سے صاف طور پر نتیجہ نکلتا ہے کہ اب انسان کو سرے سے ہدایت بذریعہ نبوت کی حاجت ہی نہیں رہی۔ یہ ایک ایسا تیر ہے جس نے بیک وقت احمدیت اور اسلام دونوں کو مجروح کیا ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ انسان جوان ہو جانے کی وجہ سے آئندہ ''نئے سہاروں'' سے مستغنی ہو گیا ہے تو پھر آخر اس بلوغ ذہنی کے بعد ''پرانے سہاروں'' کی بھی کیا ضرورت ہے۔''

(ترجمان القرآن لاہور اکتوبر 1953 صفحہ 146)

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ علامہ اقبال کا ختمِ نبوت سے متعلق نظریہ ماننے سے مذہب اسلام کے تمام روحانی فیوض و برکات کی نفی لازم آتی ہے۔ نیز جیسا کہ مولانا مودودی صاحب نے توجہ دلائی ہے کہ اس نظریہ کے ماننے سے خود مذہب اسلام سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں کیونکہ جب انسان اپنی عقلی بلوغت کے تمام زینے سر کر چکا ہے تو پھر اسے جہاں ''نئے سہاروں'' کی ضرورت نہیں تو پھر ''پرانے سہاروں'' کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔

○

امام مہدی یا امام کامل

اُمت مسلمہ میں امام مہدی کی آمد کا عقیدہ بہت پرانا ہے۔اس کا اصل ماخذ اور مصدر وہ احادیث ہیں جن میں ہمارے پیارے سیدنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے امام کے ظہور کی بشارت دی اور اس کی کئی صفات بیان فرمائی ہیں۔امت محمد یہ کے بہت سے بزرگان اور اولیاء نے اس کے ظہور کا اپنی کتب میں ذکر فرمایا اور اس کا زمانہ پانے کی خواہش کا اظہار فرمایا۔امام مہدی کی آمد کا تذکرہ اس قدر تواتر سے اسلامی لٹریچر میں موجود ہے کہ اس کے انکار کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سلسلہ میں بعض وضعی احادیث بھی راہ پا گئیں جو بعض لوگوں نے اپنے غلط مقاصد کے لئے وضع کیں اور غلط طور پر اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے غیر مناسب لوگوں پر چسپاں کرنے کی کوشش کی۔اس بناء پر اس امر کی ضرورت ہے کہ روائت اور درائت کے اصولوں پر پرکھ کر ایسی غلط احادیث کو رد کر دیا جائے۔لیکن یہ ہرگز درست نہیں کہ بعض ایسی روایات کی بناء پر اس عقیدہ کو کلیتًا غلط قرار دے دیا جائے اور ایسے امام کی آمد سے ہی انکار کر دیا جائے۔کیونکہ اس عقیدہ کا اصل منبع سیدنا آنحضرت صلعم کی متعدد احادیث ہیں اور پھر گذشتہ تیرہ صدیوں میں متعدد بزرگوں نے تواتر سے اس کی اپنے رؤیا و کشوف کے ذریعہ تصدیق فرمائی ہے اور اس کی بعض صفات کا ذکر فرمایا ہے۔

○۔ امام مہدی کے ظہور کے متعلق مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں یعنی اہل سنت اور اہل تشیع میں بھی بہت سے امور میں اختلاف پایا جاتا ہے۔لیکن اس امر پر اتفاق ہے کہ امام مہدی کا زمانہ انتہائی بابرکت ہوگا اور اس کی آمد سے اُمت مسلمہ کی کایا پلٹ جائے گی اور ان کی ترقیات کے دروازے کھل جائیں گے اور اس قدر ارضی وسماوی برکات اور خزائن کا نزول ہوگا

جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے مجموعی طور پر امت اس کی آمد کے لئے دُعا گو رہی ہے ؎

آنے والے آ، زمانے کی امامت کے لئے

روحانی امام کی آمد کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس کی آمد سے روحانی فیضان اور ساری برکات کا نزول ہوتا ہے لیکن انسانی کمزوری یہ ہے کہ وہ مادی اور دنیوی اموال واملاک کی طرف مائل ہوتا ہے۔ یہودیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کا انکار اس لئے کیا کیونکہ وہ داؤدی تاج اپنے سر پر نہ رکھتا تھا۔ نیز وہ ایسی بابرکت شخصیت کی ایک خیالی تصویر بنا کر اس کے مطابق اسے جانچنے اور اس پیمانہ کے مطابق ماپنے کی کوشش کرتے تھے۔ قرآن مجید میں خدا تعالیٰ نے ایسی خیالی تصویر کو ''اھوَاء'' سے تعبیر کیا ہے اور چونکہ آنے والا رسول یا امام اس پر پورا نہیں اترتا تو اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ

ترجمہ: ''پس کیا جب بھی تمہارے پاس کوئی رسول ایسی باتیں لے کر آئے گا جو تمہیں پسند نہیں تو تم استکبار کرو گے؟'' (البقرہ:88)

یہی صورتِ حال امام مہدی کے تصور کے متعلق ہے۔ اس دور کے علماء اور دانشور آنے والے امام کے متعلق اپنا ایک مزعوم خیالی تصور رکھتے تھے۔ جیسا کہ آئندہ باب میں تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔ علامہ اقبال امام مہدی اور امام عادل کے منتظر بھی تھے اور انسانوں کے اس خیال کو غلط اور مجوسی بھی قرار دیتے تھے۔ اس کی اصل وجہ وہی ہوائے نفس کا پیمانہ ہی تھا یہ صرف علامہ پر ہی موقوف نہیں بلکہ اس زمانے کے دیگر علماء وزعماء بھی اپنا ایک ذاتی تصور آنے والے امام کے متعلق قائم کئے ہوئے تھے۔

علامہ کے ہمعصر مولانا مودودی صاحب نے بھی اپنی کتاب ''تجدید واحیائے دین'' میں امام مہدی کا ایک ذاتی خیالی نقشہ کھینچا ہے یعنی آنے والا امام اس قسم کا ہوگا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک

دفعہ علامہ اپنی انتخابی مہم کے سلسلہ میں غالباً 1957ء یں ڈھاکہ آئے ہوئے تھے۔ ایک رات انہوں نے ڈھاکہ سے قریب ایک شہر نرائن گنج میں پبلک تقریر کی۔ خاکسار نے ان کی تقریر سنی اور اگلے روز صبح علامہ سے ان کے دفتر واقعہ نواب پور روڈ میں ملاقات کی۔ دوران گفتگو خاکسار نے مولانا کی توجہ ان کے اس خاکہ کی طرف دلائی جو انہوں نے آنے والے امام مہدی کے متعلق اپنی کتاب میں بیان کیا تھا۔ خاکسار نے مولانا سے یہ سوال کیا:

''آپ ایک عالم دین ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس لئے عوام آپ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ اسلامی مسائل کے متعلق ان کی راہنمائی قرآنِ مجید اور احادیث صحیحہ سے کریں گے۔ اگر امت محمدیہ میں ظاہر ہونے والا امام مہدی کا عقیدہ قرآن مجید اور احادیث پر مبنی ہے تو اس کی تفصیل اور علامات بھی انہی مقدس کتب کی روشنی میں بیان کی جانی چاہئیں۔ لیکن آپ نے امام مہدی کے تشخص کے متعلق اپنی خیالی باتیں بیان کی ہیں جو دوسروں کے لئے حجت نہیں ہوسکتیں کیونکہ اس طرح تو ہر عالم دین کا اپنا نقطہ نظر ہوگا اور اس کی روشنی میں ایک عام انسان کسی فیصلہ کن نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔''

اس پر مولانا نے کہا:

''یہ ٹھیک ہے کہ یہ میرا ذاتی نظریہ ہے۔ میں کسی کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ اسے ضرور مانے۔ کسی کا دل چاہتا ہے تو مان لے یا انکار کردے۔''

خاکسار نے جواباً کہا:

''یہی تو میرا سوال ہے کہ دینی امور میں ہم پر قرآن مجید اور احادیث کی پابندی واجب ہے۔ کسی عالم کی ذاتی رائے کی یہ حیثیت نہیں اس لئے کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ اُمتِ محمدیہ میں ظاہر ہونے والے امام کے متعلق اپنی ذوقی رائے کی بجائے

کوئی مستند رائے پیش فرماتے۔''

اس پر مولانا صاحب نے کہا:

''آپ میری اس کتاب کو پھر غور سے پڑھیں اس میں ذاتی رائے کے علاوہ بھی تفصیل موجود ہے لیکن اس وقت میرا دورہ ان اسلامی مسائل کی وضاحت کے لئے نہیں ہے بلکہ لوگوں کی انتخابی مہم میں راہنمائی کے لئے ہے۔''وغیرہ۔

یہی معاملہ علامہ اقبال کا تھا۔ان کو اس امر کا احساس تھا کہ زمانہ کسی روحانی مصلح اور امام کا تقاضا کر رہا ہے۔فرماتے ہیں:

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

(ضرب کلیم۔کلیات اقبال۔صفحہ 666)

ان کے نزدیک اس کلجگ کے دور میں کسی روحانی روشنی سے ہی یہ تاریکی دور ہوسکتی ہے۔ لیکن وہ اس امام کو اپنے افکار کے مطابق دیکھنا چاہتے تھے۔

دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگاہ زلزلۂ عالمِ افکار

(ضرب کلیم۔کلیات اقبال۔صفحہ 635)

خدا تعالیٰ کا ابتدائے آفرینش سے یہ قانون ہے کہ وہ جن لوگوں کو راہنمائی کے لئے مبعوث فرماتا ہے وہ کبھی بھی لوگوں کی خواہشات کے مطابق ظہور نہیں کرتے بلکہ معاملہ بالکل اس کے برعکس ہوتا ہے۔اس اصولی ہدایت اور بنیادی حقیقت کی روشنی میں علامہ کے خیالات کا جائزہ لیں تو اس کا وہی نتیجہ برآمد ہونا تھا جو ہمیشہ سے ظاہر ہوتا رہا ہے۔علامہ کے خودساختہ فارمولا کا وہی حشر ہؤا جو عام طور پر ہوتا ہے۔امام مہدی اور امام کامل زمانہ کی ضرورت کے مطابق ظاہر

ہو چکا تھا۔اس کے پہچاننے کے لئے روحانی بینائی سے کام لینا ضروری تھا۔

مردِکامل کی ناکام تلاش

جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے کہ علامہ کسی مرد کامل، مجدد یا مسیحا کے ظہور کے منتظر تھے۔زمانے کے حالات کے پیش نظر وہ سمجھتے تھے کہ یہ زمانہ کسی ایسے ہی شخص کے ظہور کا تقاضا کرتا ہے۔

لیکن ایسی عظیم شخصیت کے متعلق ان کا یہ خیال اور قیاس تھا کہ وہ کسی حکومت کا سربراہ ہوگا اور دنیوی شان وشوکت کا مالک ہوگا تاکہ وہ دنیا کی اصلاح کا کام اپنی طاقت کے بل بوتے پر سرانجام دے سکے۔اس لئے کبھی وہ امیر امان اللہ شاہ افغانستان سے اور کبھی ترکی کے کمال اتاترک اور ایران کے رضا شاہ پہلوی سے آس لگائے بیٹھے تھے کہ ان کے ذریعہ سے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا معجزہ رونما ہوگا لیکن ان کے ذریعہ ان کا موہوم خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ان اشخاص کے ذریعہ ہرگز کوئی ایسا کارنامہ سرزد نہ ہوا جس کی علامہ توقع رکھتے تھے۔

دراصل علامہ نہ صرف عالمِ اسلام کے لئے ایسے ''مردکامل'' کے منتظر تھے بلکہ خود اپنے لئے بھی کسی ایسے بزرگ کی تلاش میں تھے کہ جوان کی کایا پلٹ دے اور ایک نظر سے ان کی روحانی دنیا بدل دے۔چنانچہ جسٹس جاوید اس بارے میں تحریر کرتے ہیں:

> ''اقبال کے اہل دل مشائخ سے ملاقات کے شوق سے ظاہر ہے کہ وہ کسی ایسی ہستی کی تلاش میں تھے جوان پر ایک ہی نگاہ ڈال کر ان کی روحانی تکمیل کردے۔ جیسے خواجہ باقی باللہ نے شیخ احمد سرہندی کو خلوت میں لے جاکر ذکرِ قلبی کی تلقین کی تھی اور ان کی توجہ سے اس وقت ذکرِ قلبی جاری ہوگیا اور شیخ احمد سرہندی نے ایسی حلاوت محسوس کی جو آناً فاناً ترقی کرنے لگی۔جس کے ذریعہ انہوں نے منازلِ سلوک طے کیں۔ایک نئی نوعیت وطرز سے احیائے دین کا کام مکمل کیا۔طریقت کو شریعت

کے تابع بنایا اور وسائل کو مقاصد تک پہنچایا لیکن اقبال کو اپنی جستجو میں کامیابی نہ ہوئی۔''
(زندہ رود صفحہ 597)

گویا علامہ ایک خیالی دنیا میں بستے تھے۔ روحانیت کے لئے جس مسلسل جہاد اور محنت کی ضرورت ہے اسے اختیار کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ سراسر فلسفیانہ اور شاعرانہ تخیلات کی دنیا میں مگن تھے۔ ایسے خواب خود بھی دیکھتے تھے اور امت مسلمہ کو بھی دکھاتے تھے۔ حالانکہ اس کا عملی دنیا سے ہرگز کوئی تعلق نہ تھا۔ خدا تعالیٰ کا ابدی قانون ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ○
(العنکبوت:70)

یعنی ہم ان لوگوں کو ہی اپنے راستوں کی طرف راہنمائی کرتے ہیں جو ہمارے لئے محنت اور کوشش کرتے ہیں۔ اس عملی جہاد کے بغیر کوئی فرد اور کوئی قوم روحانی ترقیات سے ہمکنار نہیں ہوسکتی۔ اس زمانہ میں احمدیت نے اس جہاد کا آغاز کیا تھا۔ علامہ ایک عرصہ تک اس سے متاثر تھے لیکن وہ سمجھتے تھے کہ یہ طویل اور کٹھن راستہ ہے۔ وہ اپنے مقصود اور مطلوب کے لئے کسی ''شارٹ کٹ'' کی تلاش میں تھے۔ کوئی ایسا ''مرد کامل'' مل جائے جو خود ان کی اور ملک وقوم کی دیکھتے ہی دیکھتے کایا پلٹ دے۔ ایک عرصہ تک وہ اس کی امید لگائے بیٹھے رہے اور اس کی تلقین کرتے رہے لیکن گوہر مقصود ہاتھ میں نہ آنا تھا، سو نہ آیا۔ بالآخر مایوس ہو کر ان سب کا انکار کر دیا۔ اس کا موقع یوں پیدا ہوُا کہ اپنی موت سے صرف تین سال قبل جب بدنام زمانہ تنظیم احرار اسلام نے کشمیر کمیٹی کی آڑ میں جماعت احمدیہ کی مخالفت کا آغاز کیا اس دور میں علامہ جماعت احمدیہ کے مویّد تھے خود ان کے ایماء اور اصرار پر کشمیر کمیٹی کی صدارت حضرت امام جماعت احمدیہ کو سونپی گئی تھی۔ جیسا کہ آئندہ تفصیل سے بیان کیا جائے گا کہ احرار نے ایک سازش کے ساتھ علامہ کو جماعت سے دور کرنے کی کوشش کی اور ان کو یہ باور کرایا کہ وہ خود اس

کام کے اہل ہیں اور اس کا سارا کریڈٹ ان کو ملنا چاہئے۔ یہی وہ وقت تھا کہ جب علامہ نے جماعت کی مخالفت کا آغاز کیا اور حضرت بانیٔ جماعت احمدیہ کے بنیادی دعویٰ مسیحیت اور مہدویت پر یہ وار کیا کہ اسلام میں ایسا تصور قطعی غیر اسلامی اور مجوسی خیالات کے زیر اثر آیا۔ ان کا ایک پرانا غیر مطبوعہ شعر ہے ؎

مینارِ دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ
یہ انتظارِ مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے

یعنی احادیث میں جس مسیح کے دمشق کے شرقی مینارہ پر اترنے کا ذکر ملتا ہے اسے علامہ نے ''مینار دل'' قرار دیکر اس کی نفی کرنے کی کوشش کی ہے۔

پھر علامہ نے اپنی ایک نظم ''مہدیٔ برحق'' میں یہ تصور پیش کیا ہے کہ وہی شخص درحقیقت مہدی کہلانے کا مستحق ہوسکتا ہے۔ جو دنیا میں فوری طور پر ایک انقلاب برپا کر دے۔ اور جس کی ایک نگاہ سے مسلمانوں کو عالمگیر غلبہ نصیب ہو جائے ؎

دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگاہ زلزلۂ عالمِ افکار

(بال جبریل۔ مہدیٔ برحق)

گویا اگر ایسا مہدی کھڑا نہیں ہوتا تو وہ قابل التفات نہیں۔

اگر غور کیا جائے تو بخوبی علم ہوگا کہ یہ موہوم تصور ہی غیر اسلامی ہے۔ دنیا کی تمام مذہبی تاریخ میں کبھی کوئی ایسا امام مبعوث نہیں ہوا جس نے اس طرح کا کوئی روحانی انقلاب برپا کیا ہو۔ انبیاء اور مصلحین کی تاریخ مسلسل جہاد اور بے مثال قربانیوں سے بھری پڑی ہے۔ لازمی طور پر امام مہدی کی کامیابی بھی اسی راستہ پر چل کر ممکن ہوگی۔ کسی الہٰ دین کے چراغ کی توقع عبث تھی۔

○

آسمانی مصلح کا انتظار اور انکار
اقبال کے متضاد نظریات کی حقیقت

علامہ اقبال کے ختمِ نبوت کے متعلق عجیب وغریب نظریہ کا ایک طبعی نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں جس آسمانی مصلح اور ''نورِ محمدی'' کے مظہر کامل کے سراپا منتظر تھے اب احمدیت کی مخالفت کی وجہ سے اس کا کھل کر انکار کرنے لگے۔ اس نقطہ نظر سے اگر علامہ کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو ان کے باہمی متناقض خیالات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ دراصل ان کے افکار میں یہ تبدیلی احمدیت سے موافقت اور مخالفت کے ادوار کا منطقی نتیجہ تھا۔

علامہ اقبال کی اس ذہنی کیفیت کا اندازہ ان کی مشہور نظم شکوہ اور جواب شکوہ سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ ان کو ایک طرف مسلمانوں کی مذہب اسلام سے بیگانگی اور دوری کا شدت سے احساس تھا۔ اس کا کسی قدر اندازہ اس نظم کے صرف اس ایک شعر سے کیا جاسکتا ہے ؎

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود

جب مسلمان، ہنود اور یہود کے مظہر کامل ہو چکے تھے تو ان کے دل میں یہ احساس بیدار ہوتا ہے کہ اس کا ''توڑ'' کسی آسمانی مصلح کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ کسی عام عالم اور ملاں کے بس کی بات نہیں جو کہ خود اس فساد کے ذمہ دار ہیں۔ امت مسلمہ کا مرض ان کو ایسا لاعلاج معلوم ہوتا تھا کہ اس کے لئے کسی نئے مسیحا اور آسمانی مجدد کی ضرورت تھی۔ اس سے کمتر کسی منصب کے بغیر یہ کام ناممکن تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ کسی معجزانہ انقلاب کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ یعنی دیکھتے

دیکھتے پوری قوم سدھر جائے اور اس بیماری سے شفا پا جائے۔ وہ حضرت بانیٔ جماعت احمدیہ کے ذریعہ کسی قدر روحانی انقلاب کو تسلیم کرتے تھے لیکن جماعت کی اس تدریجی ترقی سے مطمئن نہ تھے۔ انکے نزدیک اس طرح گوہر مقصود جلد دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کسی پان اسلامزم (Pan Islamism) کے داعی جمال الدین افغانی یا افغانستان کے امیر امان اللہ کے ذریعہ بعض اصلاحات کے نفاذ یا ترکی کے کمال اتاترک کے انقلاب کے مداح نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ان تینوں کو اسلامی اور روحانی انقلاب سے کچھ نسبت نہیں۔ ان اشخاص سے امت مسلمہ کو کیا فائدہ حاصل ہوا ان کے ذریعہ سے ان کی قوم یا تمام امت میں کون سا تجدیدی کارنامہ برپا ہوا؟ علامہ محض ان کی وقتی اور مغربی کلچر کی تقلید کی بعض تبدیلیوں سے متاثر ہو کر ان کے مداح بن گئے۔ آج خود علامہ کے مداح ان اشخاص کو وہ مقام دینے کے لئے تیار نہیں کیونکہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ان کی اصلاحات ہرگز اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا باعث نہ تھیں۔ اس کے برعکس ان کے اقدامات اسلام کی بدنامی کا موجب ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ احمدیت سے موافقت اور مخالفت کے ہر دو ادوار میں علامہ کے دو متضاد نظریات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ موافقت کے دور میں وہ کسی آسمانی مصلح اور نئے مسیحا کے منتظر تھے جو ان کے ذہنی خیالات کے مطابق امت مسلمہ کو بدل کر رکھ دے لیکن جب علامہ بوجوہ احمدیت کی مخالفت کرنے لگے تو انہوں نے یکسر ایسے کسی وجود کے ظہور کا انکار کر دیا اور ایسے خیالات کو مجوسی عجمی اور غیر اسلامی قرار دے دیا۔ اس نقطہ سے علامہ کی زندگی کے مطالعہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ وہ روحانی انقلاب کی ماہیت سے قطعی طور پر ناواقف تھے اور صرف اپنے شاعرانہ تخیلات کی دنیا میں مگن تھے۔ ذیل میں ہم ان کی زندگی کے دونوں ادوار کی ایک جھلک پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جس سے قارئین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ علامہ کے ان متضاد نظریات کا حقیقی پس منظر کیا تھا۔

پیغامبر اور نئے مسیحا کا انتظار

جماعت احمدیہ سے مخالفت کے دور سے قبل علامہ کسی ایسے وجود کے منتظر نظر آتے ہیں کہ جو ’نورِمحمدی‘‘ کا پرتو اپنے اندر رکھتا ہو اور یکدم اس بدنصیب دنیا کی تقدیر پلٹ کر رکھ دے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک مکتوب میں اپنے والد کو تحریر کرتے ہیں:

’’تاریکی کا انجام سفیدی ہے۔ کیا عجیب کہ اللہ تعالیٰ جلد اپنا فضل کرے اور بنی نوع انسان کو پھر ایک دفعہ ’’نورِمحمدی‘‘ عطا کرے۔ بغیر کسی بڑی شخصیت کے اس بدنصیب دنیا کی نجات نظر نہیں آتی۔‘‘

(علامہ کا مکتوب اپنے والد کے نام محررہ 3 جون 1920ء بحوالہ مظلوم اقبال صفحہ 292)

اسی طرح چند سال قبل وہ اپنے ایک مکتوب میں اس خواہش کو یوں بیان کرتے ہیں:

’’کاش مولانا نظامی کی دُعا اس زمانہ میں مقبول ہو اور رسول اللہ پھر تشریف لائیں اور ہندی مسلمانوں پر اپنا دین بے نقاب کریں۔‘‘

(مکاتب اقبال۔ جلد اوّل۔ صفحہ 41 محررہ 19 جون 1916)

علامہ کی اس سوچ کا اندازہ ان کے ان فقرات سے ہوتا ہے جب وہ ایک مغربی دانشور پروفیسر میکینزی کے ان خیالات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اس دور میں ہمیں کسی پیغمبر کی ضرورت ہے۔ پروفیسر میکنزی نے اپنی کتاب ’’انٹروڈکشن ٹو سوشیالوجی‘‘ کے آخر میں لکھا:

’’کامل انسانوں کے بغیر سوسائٹی معراج کمال تک نہیں پہنچ سکتی اور اس غرض کے لئے محض عرفان اور حقیقت سے آگاہی ہی کافی نہیں بلکہ جوش اور قوتِ متحرکہ کی ضرورت ہے؟ ہمیں معلم بھی چاہئیں اور پیغمبر بھی... غالباً ہمیں نئے مسیحا کی ضرورت ہے اس عہد کے پیغمبر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس ہنگامہ زار میں وعظ

وتبلیغ کرے۔''

پروفیسر میکنزی کے ان فقرات کو علامہ اقبال نے ڈاکٹر نکلسن کو (جس نے اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ کیا تھا) اپنے خط محروہ 24 جنوری 1921ء میں نقل کر کے آخر میں لکھا:

"How very true are the last two paragraphs of Prof. Makenzie's Introduction to social Philosophy."

یعنی ''پروفیسر میکنزی کی کتاب انٹروڈکشن ٹو سوشل فلاسفی کے آخری دو پیراگرافس کس قدر صحیح ہیں۔'' (مظلوم اقبال۔صفحہ 192)

گویا پروفیسر میکنزی نے موجودہ دور کی اصلاح کے لئے کسی پیغامبر یا نئے مسیحا کی ضرورت کا اظہار کیا ہے علامہ اقبال پروفیسر صاحب کی اس سوچ کی پرزور تائید کرتے ہیں اور اسے درست قرار دیتے ہیں۔

علامہ کبھی اس عظیم روحانی وجود کو''عبدہٗ ہ'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ اصطلاح غالباً انہوں نے اس لئے وضع کی تھی تا کہ علماء کے تکفیری فتووں سے محفوظ رہ سکیں۔ جس کا ان کو کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ اس ''عبدہٗ'' کا ان کو شدت سے انتظار تھا۔ چنانچہ جاوید نامہ میں اس کا اظہار یوں کرتے ہیں:

عبد دیگر ''عبدہٗ'' چیزے دگر
ما سراپا انتظار و منتظر

(صفحہ 150)

اس ''عبدہٗ'' کی کھل کر وضاحت یوں فرماتے ہیں ۔

اوکلیم و او مسیح و او خلیل
اومحمد او کتاب او جبرئیل

(جاوید نامہ)

یعنی وہ عبدہٗ یا روحانی وجود گویا جری اللہ فی حلل الانبیاء کا مصداق ہوگا۔ اس کی وضاحت

پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب جاوید نامہ کی شرح میں یوں کرتے ہیں:

''یعنی عبدہ یا مردِ حق جس کے لئے میں سراپا انتظار ہوں آسمان سے اترتا ہے (یا اترے گا) جب حق تعالیٰ چاہتا ہے اپنے بندوں کی اصلاح کے لئے کسی نیک بندے کو جس میں سرور کائنات ﷺ کی صفات ظلی طور پر منعکس ہوتی ہیں، مامور فرما دیتا ہے۔''

گویا علامہ بروزی طور پر سیدنا آنحضرت ﷺ کا دنیا میں آنا مانتے تھے اور اس کے منتظر تھے، لیکن اپنے زمانہ کے علماء اور عوام کے خوف سے اس کا نام 'عبدہٗ' رکھتے ہیں کیونکہ قرآن مجید میں سورہ بنی اسرائیل کے شروع میں خدا تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو عبدہ کہہ کر ذکر فرمایا ہے:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ

حضور علیہ السلام کے بروزی طور پر ظہور کے علامہ قائل تھے چنانچہ ایک مکتوب میں اس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''حال کے ہیئت دان کہتے ہیں کہ بعض سیاروں میں انسان یا انسان سے اعلیٰ تر مخلوق کی آبادی ممکن ہے۔ اگر ایسا ہو تو رحمۃ للعالمین کا ظہور وہاں بھی ضروری ہے اس صورت میں کم از کم محمدیت کے لئے.... بروز لازم آتا ہے۔''

(مکاتیب اقبال نمبر 1 صفحہ 117)

''علامہ خود بھی اپنے آپ کو ''حافظ'' کا بروز سمجھتے تھے۔''

(اقبال نامہ نمبر 2 صفحہ 106)

الغرض اپنے ابتدائی زمانہ میں وہ دنیا اور خاص طور پر مسلمانوں کے ادبار اور تنزل کی حالت دیکھ کر ان کی اصلاح کے لئے کسی ''مردے از غیب'' یا حضور علیہ السلام کے بروزی طور پر ظہور کے منتظر تھے۔ چنانچہ علامہ کے فرزند جسٹس جاوید اقبال اپنی کتاب ''زندہ رود'' میں علامہ

کے اس نظریہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انہیں اس بات کا احساس تھا کہ ان کے خیالات بیشتر قدامت پسند یا روایت پرست علماء وصوفیاء کے لئے نا قابل قبول ہیں۔مگر احیاء کے کچھ تقاضے ایسے تھے کہ ان کا برملا اظہار اشد ضروری تھا۔اس بناء پر ایک طرف تو مسلم فرد اور معاشرے کی تعمیرِ نو کی خاطر ان کا منصوبہ خالصتاً عملی تجاویز پر مبنی تھا اور دوسری طرف وہ انسان کامل یا مردِ فردا کی جستجو میں لگے رہتے تھے جس نے اقبال کے مستقبل کے مثالی مسلم معاشرے کو وجود میں لانا تھا۔'' (زندہ رود صفحہ 417)

علامہ اپنی زندگی میں جس موہوم ''مردِ کامل'' کی تلاش اور انتظار میں تھے اس کا کامل مصداق ان کو کبھی نظر نہ آیا تاہم مسلم ممالک میں جس کسی شخص نے کچھ اپنی من پسند اصلاحات کرنا شروع کیں تو علامہ اس سے کچھ امید باندھ لیتے کہ شاید وہی وہ مرد کامل ہو۔اس لحاظ سے انہوں نے کبھی امیر امان اللہ سے اور کبھی ترکی کے کمال اتاترک سے اُمیدیں وابستہ کرلیں۔ کیونکہ علامہ کا خیال تھا کہ ظاہری شان وشوکت کے بغیر اسلام کی نشاۃ ثانیہ ممکن نہیں۔اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جسٹس جاوید لکھتے ہیں:

''اقبال کے ہاں اسلام کا تصور شوکت کے بغیر ناممکن ہے۔'' (زندہ رود۔صفحہ 1263)

اپنے اس نظریہ کی وجہ سے علامہ کو امیر امان اللہ اور کمال اتاترک سے اُمید تھی کہ وہ ''مرد کامل'' بن کر ابھریں گے۔مگر عملی طور پر جو کچھ ان افراد نے کیا وہ بجائے اسلام کی نیک نامی کے اس کی بدنامی کا باعث ہوئے۔

اس طرح علامہ کو وہابی تحریک کے بانی اور جمال الدین افغانی سے بھی یہ توقع تھی کہ وہ مرد کامل کے مصداق ثابت ہوں گے۔چنانچہ جسٹس جاوید لکھتے ہیں:

''اقبال سید جمال الدین افغانی کے بڑے مداح تھے اور انہیں زمانہ حال کا

مجدد سمجھتے تھے۔''   (زندہ رود صفحہ 1264)

چنانچہ انہوں نے اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطا اللہ صاحب کی تصنیف سے علامہ کا یہ تائیدی حوالہ نقل کیا ہے:

''زمانہ حال میں میرے نزدیک اگر کوئی شخص مجدد کہلانے کا مستحق ہے تو وہ صرف جمال الدین افغانی ہے۔ مصر و ایران و ترکی و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ جب کوئی لکھے گا تو اسے پہلے عبدالوہاب نجدی اور بعد میں جمال الدین افغانی کا ذکر کرنا ہوگا۔ موخر الذکر ہی اصل میں موسس ہے زمانہ حال کے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا۔ اگر قوم نے ان کو عام طور پر مجدد نہیں کہا یا انہوں نے خود اس کا دعویٰ نہیں کیا تو اس سے ان کے کام کی اہمیت میں کوئی فرق اہل بصیرت کے نزدیک نہیں آتا۔''

(زندہ رود صفحہ 1264)

علامہ اقبال نے سید جمال الدین افغانی کو عالم اسلام کے متعلق ان کی بعض مساعی کی بناء پر بڑے وثوق سے ''مجدد'' قرار دیا تھا لیکن ان کے ''تجدیدی'' کارناموں کا کیا حشر ہوا، خود جسٹس جاوید اس کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

''عالم اسلام کے اتحاد کی جو تصویر ان کی (علامہ کی۔ ناقل) نگاہوں کے سامنے اُبھری تھی ابھی تک اس کے دھندلے سے آثار بھی نمودار نہیں ہوئے اور سب کچھ گرد و غبار میں اٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔''   (زندہ رود 1265)

سید جمال الدین افغانی کو آج سے پون صدی قبل ان کی بعض عالم اسلام کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی مساعی سے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے ان کو ''مجدد'' قرار دیا تھا۔ لیکن اس قدر طویل عرصہ گذرنے کے بعد ان کے ''تجدیدی کارنامہ'' کا کیا حشر ہوا اس کے متعلق خود ان کے بیٹے معترف ہیں کہ بجائے اس کام میں کچھ پیش رفت ہونے کے صورتِ حال پہلے سے بھی زیادہ

گمبھیر ہو چکی ہے۔ دور دور تک اس پان اسلامزم (Pan Islamism) کا نام و نشان نظر نہیں آتا۔ اگر وہ واقعی اس کام کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے مامور کئے جاتے اور حقیقی مجدد ہوتے تو صورت حال مختلف ہوتی۔

ضمنی طور پر یہ عرض ہے کہ مجدد اور مصلح بنانا کسی انسان کا کام نہیں بلکہ یہ کام خود خدا تعالیٰ کا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ عَلَیۡنَا لَلۡھُدٰی ۝ (الیل:13)

یعنی لوگوں کو ہدایت دینا ہمارا کام ہے۔

اس لئے جس حدیث میں ہمارے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجددین کی آمد کی بشارت دی ہے اس میں واضح طور پر ان کی بعثت کے متعلق فرمایا کہ یہ کام خود خدا تعالیٰ فرمائے گا۔ فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهَذِهِ الأُمَّةِ عَلَى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِينَهَا

یعنی خدا تعالیٰ ہر صدی کے سر پر اس اُمت کی اصلاح کے لئے کسی شخص کو تجدیدِ دین کے لئے مبعوث فرمائے گا۔ (ابوداؤد۔ مشکوٰۃ باب العلم)

واضح ہے کہ جس شخص کو خدا تعالیٰ اس عظیم کام کے لئے کھڑا کرتا ہے تو باوجود مشکلات و مصائب کے وہ اپنا کام خوش اسلوبی سے سرانجام دیتا ہے اور خدا تعالیٰ کی نصرت اس کے شامل حال ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجدد بنانا کسی انسان کا کام نہیں۔ چنانچہ جن افراد کو لوگوں نے اس مقام پر کھڑا کرنے کی کوشش کی جیسے علامہ نے سید جمال الدین افغانی کے لئے حتمی طور پر دعویٰ کیا تو ان کا وہی حشر ہوتا ہے کہ ان کا خواب کبھی بھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلہ میں حضرت بانیٔ جماعت احمدیہ نے یہ دعویٰ کیا کہ ان کو خدا تعالیٰ نے اس منصب پر سرفراز فرمایا ہے تو باوجود شدید مخالفت کے طوفانوں کے جماعت احمدیہ گزشتہ صدی سے بدستور ترقی کے منازل طے کرتی جارہی ہے۔

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور اقبال

مادّی ذرائع سے ہوگی یا روحانی ذرائع سے؟

علامہ اقبال کو مسلمانوں کے روز افزوں انحطاط اور زوال کا بخوبی احساس تھا اور اس کا اظہار وہ برملا کرتے رہتے تھے۔اس کے علاج کے لئے وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو مادی طاقت اور دنیوی ذرائع میسر ہوں تو پھر بساط پلٹ سکتی ہے۔ان کو جماعت احمدیہ میں بہت سی خوبیاں نظر آتی تھیں جن کا وہ بعض اوقات اظہار بھی کر چکے تھے لیکن وہ سمجھتے تھے کہ اصلاح کا یہ طریق کار کافی صبر آزما ہے۔فوری انقلاب کے لئے ظاہری قوت اور شوکت کا حصول ضروری ہے۔ مصنف ''زندہ رود'' لکھتے ہیں:

''اقبال کے ہاں اِسلام کا تصور شوکت انقلاب کے بغیر نامکمل ہے۔''

(زندہ رود صفحہ 1263)

وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت وشوکت کا پیام

(کلیاتِ اقبال)

اس شعر کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا غلام رسول اپنی کتاب ''مطالبِ کلامِ اقبال'' میں لکھتے ہیں:

''جس نبوت میں مسلمانوں کے لئے قوت وطاقت اور شان وشوکت کا پیغام نہ

ہو، اسے ملت اسلامیہ کے لئے بھنگ کی پتی سمجھنا چاہئے جسے گھوٹ کر پی لینے سے انسان پر بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے اور اس کے اعضاء کام کے نہیں رہتے۔''

(مطالبِ ضربِ کلیم۔ازمولانا غلام رسول جوہر۔صفحہ 85-84)

اسی طرح ان کے ذہن میں ایک ایسے مہدی کا تصور تھا جو فوری انقلاب برپا کر سکے ۔

دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگاہ زلزلۂ عالمِ افکار

(بال جبریل۔مہدیٔ برحق)

مسلمانوں کا عام عقیدہ کہ اس آخری زمانہ میں کوئی '' مردے ازغیب'' ظاہر ہوگا جو مسلمانوں کو نشاۃ ثانیہ سے ہمکنار کرے گا۔علامہ کے نزدیک یہ تصور بعض مجوسی خیالات کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے بلکہ اس کے برعکس انہوں نے اپنے ایک مزعومہ '' مردِ کامل'' کا تصور پیش کیا ہے جو صدیوں سے بگڑی مسلم قوم کے تمام معاشرتی، اخلاقی اور روحانی مسائل کو حل کردے گا اور ان کو ایک ترقی یافتہ قوم میں تبدیل کردے گا۔چنانچہ جسٹس جاوید صاحب نے علامہ کی ایک جوابی وضاحت کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔علامہ نے لکھا:

''حقیقت یہ ہے کہ ہمیں کسی ایسی شخصیت کی ضرورت ہے جو ہمارے معاشرتی مسائل کی پیچیدگیاں سلجھائے۔ ہمارے تنازعات کا فیصلہ کرے اور بین الاقوامی اخلاق کی بنیادیں مستحکم واستوار کردے۔''

(زندہ رود صفحہ 508)

یہ گویا وہی تصور ہے جو احادیث میں آنے والے مسیح ومہدی کا بیان کیا گیا۔'' ہمارے تنازعات کا فیصلہ کرے۔'' حکماً عدلاً کا ہی ترجمہ ہے۔علامہ نے ایسے انسان کا نام ''عبدہ بھی قرار دیا ہے اور انتظار میں بیٹھے اس کی راہ دیکھ رہے تھے ۔

عبد دیگر 'عبدہٗ' چیزے دگر

ما سراپا انتظار او منتظر

(جاویدنامہ صفحہ 150)

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، علامہ اپنے عبدہ کے روحانی مقام کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

او کلیم و او مسیح و او خلیل

او محمد او کتاب او جبرئیل

پروفیسر یوسف سلیم چشتی شرح جاویدنامہ میں اس شعر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یعنی عبدہٗ یا مردِحق جس کے لئے میں سراپا انتظار ہوں آسمان سے اُترتا ہے (یا اترے گا)، جب حق تعالیٰ چاہتا ہے اپنے بندوں کی اصلاح کے لئے کسی نیک بندے کو جس میں سرکار کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات ظلی طور پر منعکس ہوتی ہیں، مامور فرما دیتا ہے۔''

آسمان سے اترنے والا ''عبدہ'' لازمی طور پر نبی اور رسول ہوگا۔ ہم بے شک زبان سے اس کا انکار کریں لیکن علامہ کا دل یہ کہتا تھا کہ بگڑی ہوئی مسلم سوسائٹی کی اصلاح اس سے کمتر درجہ والی شخصیت سے ہرگز ممکن نہیں۔ علامہ نے اپنے خط بنام سراج دین پال میں لکھا:

''ان لوگوں نے نہایت بے دردی سے قرآن اور اسلام میں ہندی اور یونانی تخیلات داخل کردیئے ہیں۔ کاش مولانا نظامی کی دعا اس زمانہ میں مقبول ہو اور رسول اللہ صلعم پھر تشریف لائیں اور ہندی مسلمانوں پر اپنا دین بے نقاب کریں۔''

(اقبال نامہ حصہ اول صفحہ 41 مکتوب 19 جولائی 1916)

اسی طرح علامہ نے اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے والد کے نام خط میں یوں کیا:

''تاریکی کا انجام سفیدی ہے۔کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ جلد اپنا فضل کرے اور بنی نوع انسان کو پھر ایک دفعہ ''نورِ محمدی'' عطا کرے.....بغیر کسی بڑی شخصیت کے اس بدنصیب دنیا کی نجات نظر نہیں آتی۔'' (مظلوم اقبال صفحہ 292)

پیغامبر اور مسیح کی ضرورت

زمانہ کی حالت اور مفاسد کی کثرت کی وجہ سے علامہ سمجھتے تھے کہ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ثانیہ یا کسی کامل انسان کی بعثت ضروری ہے۔اس خواہش کا اظہار انہوں نے کئی مواقع پر کیا۔ چنانچہ ایک مغربی دانشور پروفیسر میکینزی نے اپنی کتاب ''انٹروڈکشن ٹو سوشل فلاسفی'' کے آخر میں لکھا:

''کامل انسانوں کے بغیر سوسائٹی معراج کمال پر نہیں پہنچ سکتی اور اس غرض کے لئے محض عرفان اور حقیقت آگاہی کافی نہیں بلکہ ہیجان اور تحریک کی قوت بھی ضروری ہے.....ہمیں معلم بھی چاہئے اور پیغمبر بھی.....غالباً ہمیں ایک نئے مسیح کی ضرورت ہے۔''

علامہ اقبال نے ڈاکٹر نکلسن ،جنہوں نے ان کی کتاب 'اسرارِ خودی' کا انگریزی ترجمہ کیا تھا، کے نام 24 جنوری 1921 میں اپنے خط میں پروفیسر میکنزی کے ان دو آخری پیرا گراف کو نقل کر کے لکھا:

''پروفیسر میکینز ی کی کتاب انٹروڈکشن ٹو سوشل فلاسفی کے یہ پیرا گراف کس قدر صحیح ہیں۔''

اس خط میں یہ بھی لکھا:

''ہمارے عہد نامہ، ہماری لیگیں، ہماری پنچائتیں اور کانفرنسیں جنگ و پیکار کو صفحۂ حیات سے ختم نہیں کر سکتیں کوئی بلند مرتبہ شخصیت ہی ان مصائب کا خاتمہ کر سکتی

ہے اور اس شعر میں میں نے اس کو مخاطب کیا ہے ۔

باز در عالم بیار ایامِ صلح
جنگ جویاں را بدہ پیغامِ صلح

کامل انسان کی تلاش

علامہ اقبال اپنی اس خواہش کے مطابق کسی ایسی عظیم ہستی یا کامل انسان کی تلاش میں کوشاں رہے۔ چنانچہ اس کا ذکر کرتے ہوئے جسٹس جاوید تحریر کرتے ہیں:

''اقبال اپنے محبوب صوفیاء کے مزاروں پر اکثر حاضری رہتے اور علماء و مشائخ کے طبقے میں جس کسی کی بھی شہرت سنتے اس کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے۔

اقبال کے اہل دل مشائخ سے ملاقات کے شوق سے ظاہر ہے کہ وہ کسی ایسی ہستی کی تلاش میں تھے جو ان پر ایک ہی نگاہ ڈال کر ان کی روحانی تکمیل کر دے۔ جیسے خواجہ باقی باللہ نے شیخ احمد سرہندی کو خلوت میں لے جا کر ذکر قلبی کی تلقین کی تھی اور ان کی توجہ سے اس وقت ذکر قلبی جاری ہو گیا.....لیکن اقبال کو اپنی جستجو میں کامیابی نہ ہوئی۔'' (زندہ رود صفحہ 596۔597)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کا غالباً مقصد یہ تھا کہ کوئی ایسا کامل وجود مل جائے جو بغیر ان کے کسی مجاہدہ یا سلوک کی منازل طے کرنے کے صرف اس بزرگ کی نفخ روح سے ہی کامل انسان بن جائیں اور اس طرح شائد وہ دنیا کی اصلاح کے لئے کوئی انقلابی کارنامہ سرانجام دے سکیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے بھی تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے کہ علامہ کو اس میں کچھ کامیابی نہ ہوئی بلکہ مایوسی کا ہی سامنا کرنا پڑا۔

امیر امان اللہ خاں سے توقعات

اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ اکنافِ عالم میں اور خاص طور پر ملکِ ہند میں مسلمانوں کے تنزل و ادبار کو شدت سے محسوس کرتے تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے خدا تعالیٰ سے بھی ''شکوہ'' کیا اور گستاخانہ لہجہ اختیار کیا۔ اس صورتِ حال کے علاج کے لئے کبھی وہ آنحضور صلعم کی بعثت ثانیہ کی خواہش کرتے یا کوئی ایسی کامل ہستی ہو جو مسلمانوں کو فتح و کامرانی سے ہمکنار کردے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ یہ صورت محض وعظ و تذکیر سے ممکن نہیں بلکہ قوت و شوکت بھی ضروری ہے تاکہ بزورِ بازو ان اصلاحات کو نافذ کیا جا سکے۔ اسی وجہ سے جب ہمسایہ ملک افغانستان میں امیر امان اللہ نے اپنے والد حبیب اللہ کے قتل کے بعد تخت سنبھالا اور انگریزوں سے آزادی حاصل کی اور افغانستان میں بعض اصلاحات نافذ کرنے کی کوشش کی تو علامہ ان سے کئی توقعات وابستہ کر بیٹھے اور یہ سمجھنا شروع کیا کہ شاید ان کے ذریعہ سے مسلمانوں کی تقدیر بدل سکتی ہے۔

امیر امان اللہ خان نے 1919ء میں افغانستان کا اقتدار سنبھالا اور تقریباً دس سال تک وہاں کے سیاہ وسفید کے مالک رہے۔ علامہ ان سے کس قدر متاثر تھے اور ان سے کیا کیا امیدیں وابستہ کئے ہوئے تھے اس کا کچھ اندازہ جسٹس جاوید کی ''زندہ رود'' کے اس اقتباس سے کیا جا سکتا ہے:

> ''اقبال افغانستان کے حالات میں گہری دلچسپی رکھتے تھے کیونکہ وہ ایک مسلم ملک ہونے کے علاوہ برصغیر کے شمال مغربی مسلم اکثریتی صوبوں کا ہمسایہ تھا۔ افغانستان کو تیسری افغان جنگ کے بعد امیر امان اللہ خان کے ہاتھوں مکمل آزادی نصیب ہوئی تھی۔ اس لئے اقبال کو امیر امان اللہ خان کی ذات سے نہ صرف عقیدت تھی بلکہ ان سے بڑی توقعات بھی وابستہ تھیں۔ اس بنا پر انہوں نے اپنی

تصنیف ''پیامِ مشرق'' امیر امان اللہ خان کے نام مُعَنْوَن کی۔ لیکن امیر امان اللہ خان نے افغانستان میں چند ایسی اصلاحات نافذ کرنے کی کوشش کی جو سیکولر نوعیت کی اور اسلام کے منافی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علماء ان کے خلاف ہو گئے اور 14 نومبر 1928ء کو افغانستان میں بغاوت کی ابتداء ہوئی۔ ہندوستان کی انگریزی حکومت نے اپنی اغراض کے پیشِ نظر باغیوں کی امداد کی۔ بالآخر 17 جنوری 1929ء کو بچہ سقہ نامی ایک باغی نے کابل پر قبضہ کرلیا اور امیر امان اللہ خان کو ملک بدر کر دیا گیا۔''

(زندہ رود صفحہ 675)

امیر امان اللہ خاں کی انگریزی حکومت کے خلاف فتح اور افغانستان میں بعض اصلاحات کے نفاذ کی بناء پر اسے ''غازی'' اور ''شاہ'' کے القابات سے نوازا گیا تھا۔ علامہ نے بھی ان سے بہت توقعات وابستہ کرلیں۔ غالباً وہ سمجھتے تھے کہ جس ''مردِ کامل'' کی وہ تلاش میں ہیں شاید امیر امان اللہ خاں ہی اس کے مصداق ہوں۔ اس بناء پر انہوں نے اپنی کتاب ''پیامِ مشرق'' کو ان کے نام پر مُعَنْوَن کیا۔ لیکن چند ہی سالوں میں امیر کی مغربی نقل کی اصلاحات کی حقیقت کھل کر سامنے آ گئی اور ان کی حکومت اس قدر بودی ثابت ہوئی کہ بچہ سقہ جیسے رذیل شخص کے سامنے نہ ٹھہر سکی اور امیر کو بھاگ کر اٹلی میں پناہ لینا پڑی۔

مصطفیٰ کمال پاشا

اسی عرصہ میں 1924ء میں تُرکی میں مصطفی کمال پاشا نے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کر دیا۔ اس کو بھی علامہ نے سراہا اور جو لوگ خلافت کا احیاء چاہتے تھے۔ آپ ان کے حق میں نہ تھے اس کے متعلق جسٹس صاحب لکھتے ہیں:

''اقبال اس حکمت عملی کو سمجھتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ عصرِ حاضر میں

خلافت کا احیاء مسلمانوں کے لئے نقصان دہ ہے اور مسلم اقوام کے اتحاد کے لئے
کوئی اور تدبیر سوچنے کی ضرورت ہے۔'' (زندہ رود صفحہ 717)

سلطان ابن سعود

یہی وہ زمانہ تھا کہ جس میں سلطان ابن سعود نے 1922ء میں نجد اور 1925ء میں حجاز کے علاقے فتح کر لئے اور سعودی عرب میں اس کی حکومت مستحکم ہوگئی۔ چونکہ سعودی عرب کے لوگ امام محمد بن عبدالوہاب (1792-1703) کے فقہی مسلک کی پیروی کرنے والے تھے اس لئے ہندوستان میں لوگ ان کو وہابی کہتے اور ان کے خلاف کفر کے فتوے جاری کئے گئے تھے۔ علامہ نے سلطان ابن سعود کے حق میں بیان جاری کیا۔ اس بناء پر سنی علماء نے علامہ کے خلاف بھی کفر کے فتوے دے دیئے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے جسٹس جاوید لکھتے ہیں:

''ان علماء کو بھی جو عرصہ دراز سے ان کے خلاف ادھار کھائے بیٹھے تھے اقبال پر کفر کا فتویٰ صادر کرنے کا بہانہ مل گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سلطان ابن سعود کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان کشمکش جاری تھی اور ہندوستان کے مسلمان دو مذہبی گروہوں یعنی وہابیوں اور سنیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اقبال نے سلطان ابن سعود کی حمایت میں بیان دے کر ان کے مخالف علماء کی عداوت مول لے رکھی تھی۔'' (زندہ رود صفحہ 609)

''درحقیقت علامہ اقبال امام عبدالوہاب نجدی کو بھی اس دور کا مجدد گردانتے تھے۔'' ('زندہ رود' صفحہ 1264)

ان کا اندازہ تھا کہ عرب میں ابن سعود کی حکومت جلد مستحکم ہوجائے گی اور ان کے ذریعہ عالم اسلام ایک قوت بن کر ابھرے گا۔ لکھتے ہیں:

''بہت ممکن ہے کہ عرب میں ابن سعود کے ماتحت ایک زبردست قومی تحریک نشوونما پائے....'' (زندہ رود صفحہ 601)

سید جمال الدین افغانی

علامہ مختلف اوقات میں بعض اشخاص کی وقتی کامیابی اور بعض خدمات کی بناء پر ان کی تعریف میں رطب اللسان رہے اور ان سے بڑی توقعات وابستہ رکھتے رہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی بلکہ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

والا معاملہ تھا۔ اس سلسلہ میں علامہ سید جمال الدین افغانی کے متعلق حتمی طور پر سمجھتے تھے کہ وہی اس صدی کے مجدد ہیں اور ان کے ذریعہ سے ہی پان اسلامزم (Pan Islamism) کا خواب شرمندہ تعبیر ہوگا۔ چنانچہ جسٹس جاوید اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''اقبال سید جمال الدین افغانی کے بڑے مداح تھے اور انہیں زمانہ حال کا مجدد سمجھتے تھے۔''

چنانچہ فرماتے ہیں:

''زمانہ حال میں میرے نزدیک اگر کوئی مجدد کہلانے کا مستحق ہے تو وہ صرف جمال الدین افغانی ہے۔ مصر و ایران و ترکی و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ جب کوئی لکھے گا تو اسے پہلے عبدالوہاب نجدی اور بعد میں جمال الدین افغانی کا ذکر کرنا ہوگا۔ موخر الذکر ہی اصل میں موسس ہے۔ زمانہ حال کی نشاۃِ ثانیہ کا اگر قوم نے ان کو عام طور پر مجدد نہیں کہا یا انہوں نے خود اس کا دعویٰ نہیں کیا تو اس سے ان کے کام کی اہمیت میں کوئی فرق اہل بصیرت کے نزدیک نہیں آتا۔'' (زندہ رود صفحہ 1264)

اس مضمون کے آخر میں جسٹس جاوید صاحب کو یہ تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ پون صدی سے زائد عرصہ گذرنے کے بعد علامہ کا اور سید جمال الدین افغانی کا پان اسلامزم (Pan Islamism) کا ہلکا سا تصور بھی نہیں ابھر سکا بلکہ صورت حال پہلے سے بدتر ہی ہے۔ لکھتے ہیں:

''اقبال کو یقین تھا کہ رفتہ رفتہ ایسی صورت حالات پیدا ہو رہی ہے کہ عالم اسلام کا اتحاد کسی نہ کسی ہیئت میں بالآخر ایک سیاسی یا جغرافیائی حقیقت بن جائے گا۔ بہرحال اس اعتبار سے بھی اقبال آئندہ یا مستقبل کے مفکر تصور کئے جائیں گے کیونکہ عالم اسلام کے اتحاد کی جو تصویر ان کی نگاہوں کے سامنے ابھری تھی ابھی تک اسکے دھندلے سے آثار بھی نمودار نہیں ہوئے اور سب کچھ گرد و غبار میں اٹا ہؤا دکھائی دیتا ہے۔''

(زندہ رود صفحہ 1265)

الغرض علامہ اقبال اپنی زندگی میں اپنے مزمومہ ''مردِ کامل'' کی تلاش میں لگے رہے اور بعض کی نشاندہی بھی کرتے رہے لیکن ان میں سے کوئی بھی نہ احیائے دین کر سکا اور نہ ہی مثالی مسلم معاشرہ معرض وجود میں آسکا۔ چنانچہ جسٹس صاحب تحریر کرتے ہیں:

''اُس بناء پر ایک طرف تو مسلم فرد اور معاشرے کی تعمیر نو کی خاطر ان کا منصوبہ خالصتاً عملی تجاویز پر مبنی تھا اور دوسری طرف وہ اس انسان کامل یا مرد فردا کی جستجو میں لگے رہتے تھے جس نے اقبال کے مستقبل کے مثالی مسلم معاشرے کو وجود میں لانا تھا۔'' (زندہ رود صفحہ 417)

علامہ اقبال نے خود تو اس امر کا دعویٰ یا اظہار نہ کیا کہ اس زمانہ کے وہ ''مردِ کامل'' ہیں البتہ اب ان کے بیٹے جسٹس جاوید صاحب نے اپنی کتاب ''زندہ رود'' میں ان کو ''مفکر احیائے اسلام'' اور مجدد الف ثانی کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اقبال دراصل احیائے اسلام کے لئے شاعر و مفکر تھے اس لئے ان کے ذہنی ارتقا کو تحریک احیائے اسلام کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔''(زندہ رود صفحہ 383)

مزید لکھتے ہیں:

''وہ مفکر و شاعر احیائے اِسلام تھے اس لئے اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف ان کا رجوع کرنا لازمی تھا۔ اس اعتبار سے وہ اس لڑی کا ایک موتی تھے جن میں ابن تیمیہ اور شیخ احمد مجدد الف ثانی جیسی برگزیدہ ہستیوں کو پرویا جا سکتا ہے۔''

(زندہ رود صفحہ 510)

حقیقت یہ ہے کہ ملک میں علامہ کو''شاعرِ مشرق'' کا درجہ دینے کے بعد اقبالیات کا ایک ایسا گروہ پروان چڑھ رہا ہے کہ جو نہ صرف ان کو مجددین کی صف میں لانے کی کوشش کر رہا ہے بلکہ ان کی جوانی کی سرمستیوں کا اعتراف کرنے کے ساتھ ان کو علی الاعلان''ولی'' بلکہ''پیغمبرانہ اعجاز'' رکھنے والے بزرگ کا درجہ دے رہا ہے۔ جسٹس جاوید علامہ کے ایک ساتھی مرزا جلال الدین کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''اقبال آخر انسان تھے پیغمبرانہ اعجاز رکھنے کے باوجود پیغمبر نہ تھے۔''

(زندہ رود صفحہ 375)

اسی طرح وہ ان کے ایک اور ساتھی محمد دین تاثیر کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''اقبال کی رندی کوئی راز نہیں لیکن یہ رندی بیشتر لفظی اور خیالی رندی تھی۔ جوانی کا زور تھا اور بس.... میں اقبال کو ولی نہیں کہتا لیکن ایسا تہجد خواں، عاشق رسولؐ، اولیاء کا خادم اور عقیدت گزار، خوش عقیدہ، گداز قلب مسلمان انگریزی دانوں میں کم دیکھا ہے۔ مگر مزاج میں رندی موجود تھی۔''(زندہ رود صفحہ 375-376)

اس بارہ میں جسٹس صاحب خود علامہ کا کلام نقل کرتے ہیں:

رند کہتا ہے ولی مجھ کو ولی رند مجھے
سن کے دونوں کی تقریر کو حیران ہوں میں
زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

اس بارے میں اصولی بات یہ ہے کہ کسی شخص کے روحانی مقام کی تعین یا تردید کسی انسان کا کام نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ ؕ (الانعام:125)

یعنی خدا تعالیٰ ہی بہتر طور پر جانتا ہے کہ کون انسان کامل ہے اور اس روحانی فریضہ کی ادائیگی کا اہل ہے۔ حضرت موسیٰ جیسے عظیم شخص بھی یہی سمجھتے تھے کہ ان کے بھائی ہارون اس کام کے زیادہ اہل ہیں لیکن حالات نے ثابت کیا کہ خدائی انتخاب ہی درست تھا۔

علامہ اقبال کو اپنی ذہنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر یہ خوش فہمی تھی کہ وہ کسی کامل انسان کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو ان کی توقع کے مطابق اسلام کے احیاء اور اس کی نشاۃِ ثانیہ کا عظیم فریضہ سرانجام دے سکے گا۔ ان کے نزدیک آنحضرت ﷺ کی ختمِ نبوت کے بعد خدا تعالیٰ نے ایسے شخص کا انتخاب انسانوں پر چھوڑ دیا ہے اور انسان اپنی عقلی بلوغت کے اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ وہ بخوبی خود اس کام کو سرانجام دے سکتا ہے۔ علامہ کی اپنی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ان کو خود اپنے متعلق یہ گمان تھا کہ وہ خدا تعالیٰ کی ایسی عمدہ تخلیق ہیں کہ گویا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ بھی اس پر ناز کرتا ہے۔ اپنے متعلق کہتے ہیں:

دیکھ اے چشمِ عدو! مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انسان ہوں میں

(زندہ رود صفحہ 375)

حالانکہ قرآن مجید نے تمام بنی نوع انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور ان کی ہدایت کے لئے خود انتظام کرنے کا وعدہ فرمایا ہے: اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى

اس غرض کے لئے خدا تعالیٰ ہی کسی ایسے بہترین شخص کا انتخاب فرماتا ہے جو اس فرض کو بخوبی سرانجام دے سکتا ہے۔ شخصی انتخاب میں ہمیشہ غلطی کا امکان ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ نے جن اشخاص کے متعلق اپنی امیدیں وابستہ کیں اور ان میں سے بعض کو مجدد بھی قرار دیا ان سب کی ناکامی اور نامرادی خود علامہ نے اپنی زندگی میں ہی مشاہدہ کر لی۔

اسلام کی نشاۃ ثانیہ الٰہی وعدوں کے مطابق مقدر ہے اور اس کے لئے خود خدا تعالیٰ نے انتظام عین وقت پر فرمایا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کے انتخاب کو قبول کر کے اس کے دست و بازو بن جائیں اور خدائی انعامات کے وارث ٹھہریں۔

○

علامہ اقبال کا خدا تعالیٰ سے شکوہ اور گلہ

جسٹس جاوید نے اپنی کتاب ''زندہ رود'' میں علامہ اقبال کی ایک ایسی بات بیان کی ہے کہ جس کا کسی مسلمان اور مرد مومن کے متعلق تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لکھتے ہیں:

''اقبال کا کسی مسلمان اور مرد مومن یا انسان کامل دراصل ایک طاقت ور انسانی شخصیت ہی ہے اور ان کے عشق رسول کا راز بھی یہی تھا کہ وہ آنحضور ؐ کو انسان کامل تصور کرتے تھے۔ ایک واقعہ مشہور ہے اقبال سے فلسفے کے کسی انگریز پروفیسر نے پوچھا کہ آپ کے پاس خدا کا وجود ثابت کرنے کے لئے کون سی دلیل ہے جواب دیا فقط یہی کہ حضرت محمد ﷺ نے ایسا فرمایا ہے۔ اس بنا پر اقبال اپنے تصورات کے عالم میں خدا سے تو گستاخی کے تو مرتکب ہوتے ہیں مگر محمد ﷺ کے عشق میں ایسے گرفتار ہیں کہ ان کے منہ سے آنحضور ﷺ کی مدح و ستائش اور احترام کے الفاظ نکلتے ہیں۔'' (زندہ رود صفحہ 1271)

گویا جسٹس صاحب کو اس امر کا اعتراف ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے کلام میں بعض مقامات پر خدا تعالیٰ کی شان میں گستاخانہ لہجہ اختیار کیا ہے۔ لیکن انہوں نے خدا تعالیٰ کے رسول کے لئے ہمیشہ تعریفی کلمات بیان کئے ہیں یہ محبت کا عجیب انداز ہے کہ علامہ حضور ﷺ کی سب سے محبوب اور مقدم ہستی کی شان میں گستاخی کو معمولی امر تصور کرتے تھے حالانکہ حضور ﷺ داعی الی اللہ تھے اور ان کی بعثت کی غرض ہی یہ تھی کہ لوگوں کے دلوں میں اپنے خالق و مالک کی محبت پیدا کریں۔ اس غرض کے لئے انہوں نے اپنے عملی نمونہ سے اس محبت کا ثبوت دیا۔ آپ خدا تعالیٰ کی محبت اور عشق میں اس قدر سرشار اور گرفتار تھے کہ مشرکین مکہ بھی اس کو

محسوس کرتے تھے۔ تبھی تو وہ آپ کے متعلق یہ کہتے تھے:

عَشِقَ مُحَمَّدٌ عَلٰی رَبِّہٖ   محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے خدا کے عاشق ہیں۔

خود خدا تعالیٰ نے حقیقی مومنوں کا یہ وصف بیان فرمایا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَنۡدَادًا یُّحِبُّوۡنَہُمۡ کَحُبِّ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ۔   (البقرۃ:166)

یعنی بعض لوگ ایسے ہیں کہ وہ اپنے بتوں سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی کہ خدا تعالیٰ سے کرنی چاہئے لیکن مومن ہمیشہ خدا تعالیٰ سے بڑی شدت سے محبت کرتے ہیں۔

اس کی تشریح کرتے ہوئے حضرت بانی جماعت احمدیہ نے اپنے فارسی اشعار میں فرمایا:

ہر چہ غیرے خدا بخاطر تُست

اے بتِ تست اے بایماں سست

(براہین احمدیہ۔ جلد 1 ص 127)

یعنی اگر خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں کسی چیز کی محبت کسی مومن کے دل میں پائی جاتی ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ایک قسم کا بت ہے جو دل کے اندر موجود ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیدنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے محبت ایمان کے حصول اور تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ خدا تعالیٰ نے خود فرمایا ہے:

اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ۔   (آل عمران:33)

یعنی اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو اے رسول تو ان کو بتا دے کہ تم میری پیروی کرو اس کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ بھی تم سے محبت کرے گا۔

گویا خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت لازم ملزوم ہیں۔ خدا تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کے لئے اس کے رسول کی محبت ضروری ہے اور اس کا طبعی نتیجہ یہ ہوگا کہ رسول کی محبت سے خدا

تعالیٰ سے محبت پیدا ہوگی بلکہ خدا تعالیٰ خود ایسے مومن اور سالک سے محبت کا سلوک فرمائے گا۔

الغرض حقیقی ایمان کی ابتداء ہی خدا تعالیٰ کی ذات سے ہے اور اس کی انتہاء اور کمال بھی خدا تعالیٰ کی محبت ہے۔ خالق اور مخلوق میں رشتۂ عبودیت، وفا شعاری اور کامل اطاعت کا ہے۔ اس میں کوئی ایسا مقام نہیں آتا کہ جہاں انسان اپنے خالقِ حقیقی سے گلہ اور شکوہ کرنے بیٹھ جائے۔ گلہ اور شکوہ ہمیشہ برابری کی سطح پر ہوتا ہے۔ یہ امر تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ مالک اور اپنے سے بالا مقام والے شخص سے شکوہ نہیں کیا جاتا بلکہ صرف فریاد اور درخواست ہی کی جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ جو خالق و مالک ہے اس سے شکوہ کا ہرگز کوئی جواز نہیں بنتا۔

علامہ اقبال کی شہرت کا آغاز ان کی مشہور نظم شکوہ سے ہوا جو 1911ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں پڑھی گئی۔ اس نظم ''شکوہ'' کا پس منظر بیان کرتے ہوئے جسٹس جاوید تحریر کرتے ہیں:

> ''1911ء میں اقبال اپنے گردونواح سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اپنی ذاتی محرومیوں، مسلمانانِ ہند کی مایوسیوں اور دنیائے اسلام پر پے در پے نازل ہوتی ہوئی مصیبتوں کے ردِعمل کے طور پر ان کا جذبِ اندرون ''شکوہ'' جیسی معرکۃ الاراء نظم کی صورت میں پھوٹ نکلا۔'' (زندہ رود صفحہ 311)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دور میں عالمِ اسلام شدید بحران سے دوچار تھا۔ مسلمان ہر طرف پسپا ہو رہے تھے۔ خاص طور پر ترکی کی خلافت عثمانیہ کے زیرِ نگین تمام ممالک مغربی حکومتوں نے ہتھیا لئے تھے۔ ترکی کو یورپ کا 'مردِ بیمار' کا لقب دے دیا گیا۔ انہی ایام میں باوجود مسلمانوں کی کوشش کے کہ بنگال کی تقسیم قائم نہ رہی اور ہندوؤں کے شدید احتجاج پر خود جارج پنجم نے ہندوستان میں آکر اسے منسوخ کر دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے تنزل کی یہ کیفیت گزشتہ صدی میں بدستور ترقی پذیر ہے۔ علامہ کا اس وقت ردِعمل ''شکوہ'' کی صورت میں

سامنے آیا۔سوال یہ ہے کہ کیا کسی صورت میں بھی ایک بندہ کے لئے یہ جواز نکلتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے شکوہ کرے۔صرف ''خاکم بدہن'' کہنے سے اس کی سنگینی کم نہیں ہو جاتی ۔ نیز کیا جواب شکوہ لکھنے سے اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔

خدا تعالیٰ سے گلہ اور شکوہ وہی انسان کر سکتا ہے جسے خدا تعالیٰ کی ہستی کے متعلق پورا ادراک نہ ہو۔شکوہ ہمیشہ اپنے ہم پلہ سے کیا جاتا ہے۔شکوہ ایک قسم کی ظلم کے خلاف آواز ہوتی ہے۔ان دونوں صورتوں کا خدا تعالیٰ کی بلند و بالا اور خالق ہستی کے متعلق تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔خدا تعالیٰ سے ہمیشہ گریہ وفریاد کی جاتی ہے، جیسا کہ علامہ کے ہمعصر مولانا حالی نے اپنی مسدس میں کہا تھا۔اگر حفظ مراتب کا خیال نہ رکھا جائے تو صرف یہ گستاخی اسے زندیقی تک لے جاتی ؏

گر حفظ مراتب نکنی زندیقی

پھر اس شکوہ میں خدا تعالیٰ کے متعلق جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ انتہائی سنگین ہے۔ایسی زبان کا استعمال تو انسان اپنے بے تکلف دوست کے متعلق بھی نہیں کر سکتا۔علامہ کی اس سوقیانہ زبان کو تحریر کرتے ہوئے بھی دل کانپتا ہے۔مسلمانوں کے مقابلہ میں چونکہ غیر اقوام خدا تعالیٰ کی صفت رحیمیت سے فائدہ اٹھا کر ترقی کے زینے طے کر رہی ہیں اور مسلمان اپنی کرتوتوں کی وجہ سے ذلیل ہو رہے ہیں تو بجائے اپنی غلطیوں کی طرف نگاہ کرنے کے خدا تعالیٰ کو ''ہرجائی'' قرار دینا انتہائی شرمناک ہے:

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں، تو بھی تو ہرجائی ہے

(بانگ درا۔کلیات اقبال۔صفحہ 256)

ایسے الفاظ کا استعمال ایک شریف انسان کسی دوسرے عام انسان کے متعلق نہیں کر سکتا۔کجا یہ کہ خدائے بزرگ و برتر کے لئے بے محابا اس کا استعمال کیا جائے۔علامہ کا کانشنس ان کو خبردار

کر رہا تھا کہ خدا تعالیٰ کے متعلق ایسی زبان استعمال نہیں کرنی چاہیئے پھر بھی انہوں نے اپنے دل کی بات سرعام کہہ دی۔ ایسا فعل وہی کرسکتا ہے جو خدا تعالیٰ کے بلند و بالا مقام سے ناواقف ہو۔ کیا ایسا انسان حکیم الامت کہلانے کا مستحق ہے؟ پھر اپنی شاعرانہ ترنگ میں یہ بھی کہہ دیا:

پھر بھی ہم سے یہ گِلا ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں، تُو بھی تو دِلدار نہیں

(بانگ درا۔کلیات اقبال۔صفحہ 253۔فضلی سنز اُردو بازار کراچی)

گویا علامہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ چونکہ مسلمان سیدنا آنحضرت ﷺ کے نام لیوا ہیں اس لئے خدا تعالیٰ کو قطعِ نظر ان کے اعمال اور بے راہ روی کے ان کی خاطر داری کرنی چاہیئے۔ گویا علامہ خدا تعالیٰ کو اپنے پر قیاس کر رہے ہیں۔ حالانکہ خدا تعالیٰ کا واضح اعلان ہے:

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ (الفرقان:78)

اگر انسان خدا تعالیٰ کی بات نہیں سنتا اور مانتا تو خدا تعالیٰ کو بھی اس کی ہرگز کچھ پروا نہیں۔ خدا تعالیٰ کے حضور صرف عمل صالح مقبول ہے زبانی دعویٰ کچھ وزن نہیں رکھتا۔

کہا یہ جاتا ہے کہ علامہ عاشق رسول تھے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اس عشق کا تقاضا یہ تھا کہ اس بارہ میں آنحضور ﷺ کے اُسوۂ حسنہ پر عمل کیا جاتا۔ آپ ﷺ کو اور آپؐ کے اصحابؓ کو ساری زندگی اور خاص طور پر مکّی زندگی میں قریش مکہ کی طرف سے غیر معمولی مظالم کا سامنا تھا۔ شعبِ ابی طالب میں کئی سال تک محصور کرنے کی داستاں ہی لرزہ خیز ہے۔ لیکن ان سب حالات میں حضور نے کبھی خدا تعالیٰ سے شکوہ نہیں کیا کہ کیوں ظالموں کو کھلی چھٹی دے دی گئی ہے بلکہ حضور نے ہمیشہ دعاؤں اور تضرعات کا سہارا لیا اور اس کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کی نجات کی اور پھر فتح و نصرت کی صورت پیدا فرما دی۔ حقیقت یہی ہے کہ علامہ کے دور میں اور آج بھی مسلمان اپنے تنزل کے خود ذمہ دار ہیں۔ اور اس بارہ میں خدا تعالیٰ کا اٹل قانون ہے جس کا

اس نے قرآن مجید میں ذکر فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ (الرعد:12)

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

علامہ کی خدا تعالیٰ کی ذات سے شکوہ کرنے کی یہی عادت تھی کہ جس کا اظہار انہوں نے نہ صرف مسلمانوں کی حالت زار کے متعلق خدا تعالیٰ سے کیا بلکہ خود اپنے مخدوش مالی حالات کے متعلق یوں شکوہ کیا:

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ، رزاقی نہیں ہے

(بانگ درا۔کلیات اقبال۔صفحہ 428)

خدا تعالیٰ کی رزاقیت کا مذاق اڑانا اور اسے بخیل کہنا بہت ہی غیر مناسب اور نازیبا طریق ہے۔آج اقبالیات کے شیدائی اس امر کا رونا روتے ہیں کہ علامہ کی زندگی میں جو مالی تنگی ترشی تھی اس پر اس عہد کے امراء اور نوابوں نے کیوں کماحقہ توجہ نہ دی۔ظاہری لحاظ سے علامہ کو باوجود اعلیٰ تعلیمی کوائف، عوام میں مقبولیت اور اپنے اثر و رسوخ کے کبھی بھی کوئی عہدہ نہ ملا اور کوئی ڈھب کی آمدنی کی صورت پیدا نہ ہوئی۔ جب بھی کوئی موقع پیدا ہوتا تو جیسا کہ ان کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد صاحب نے تحریر کیا ہے کہ ہاتھ سے یوں نکل جاتا ؎ دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا

1923ء میں پنجاب میں چیف جسٹس کے تقرر کے لئے موقع تھا لیکن اس وقت چیف جسٹس سر شادی لعل کی سازش آڑے آئی۔جسٹس جاوید اس بارہ میں لکھتے ہیں:

''اقبال جیسی شخصیت بھی اپنی تمام صلاحیتوں اور صلح جوئی کے باوجود سر شادی لعل جیسے ہندو کے تعصب کا نشانہ بنی۔'' (زندہ رود صفحہ 605)

اسی طرح 1935ء میں وائسرائے کونسل میں تقرر کے لئے بظاہر تمام حالات سازگار تھے لیکن اس دفعہ بھی ان کو شدید مایوسی ہوئی اور چوہدری ظفر اللہ خاں کے تقرر پر ان کا ردِّعمل جماعت احمدیہ کے خلاف مضامین اور حکومت سے ان کے غیر مسلم قرار دینے کے مطالبہ کی صورت میں سامنے آیا۔

ہمیں کامل یقین اور ایمان ہے کہ اگر علامہ ایسے نازک حالات میں بجائے خدا تعالیٰ سے گلہ اور شکوہ کرنے کے اس کے حضور استغفار اور دعاؤں کا طریق اختیار کرتے تو لازمی طور پر صورت حال مختلف ہوتی۔ خدا تعالیٰ نے علامہ کو جو غیر معمولی صلاحیتیں وافر مقدار میں عطا کی تھیں اگر وہ خدا تعالیٰ کے حضور ان کا صحیح طور پر شکر ادا کرتے تو الٰہی وعدہ

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (ابراھیم: 8)

کے مطابق خدا تعالیٰ مزید انعامات سے نوازتا۔ لیکن انتہائی افسوسناک امر یہ ہے کہ علامہ کی ساری سوانح حیات یا شاعری کا مطالعہ کر جائیں کسی جگہ شکر خداوندی کے جذبات کا اظہار نہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (سورہ محمد آیت 39)

خدا تعالیٰ بے نیاز ہستی ہے۔ ہر حال میں ہم ہی اس کے محتاج ہیں۔ ایسی ہستی سے لاتعلقی اور اس سے شکوہ شکایت انسان کو ہرگز زیب نہیں دیتا۔

علامہ درحقیقت شروع سے ہی سرسید کے مسلک کے پیروکار تھے اور دینی اور سیاسی لحاظ سے ان کو سراہتے تھے۔ سب جانتے ہیں کہ سرسید نیچری خیالات رکھتے تھے۔ وہ دعا کے قائل ضرور تھے لیکن اسے عبادت کا ایک حصہ سمجھتے تھے اور اس بات کو نہیں مانتے تھے کہ دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ گویا استجابت دعا کے منکر تھے۔ امام زمانہ سیدنا حضرت مسیح موعودؑ نے ان کو قبولیت دعا کا تجربہ کرنے کی برملا دعوت دی اور فرمایا:

کرامت گرچہ بے نام و نشان است
بیا بنگر ز غلمانِ محمد

یعنی اگرچہ قبولیت دعا کی کرامت اس وقت دنیا سے ناپید ہو چکی ہے۔ تاہم آج بھی سیدنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ادنیٰ غلاموں کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

افسوس سرسید نے حضورؑ کی اس کھلی دعوت کو قبول نہ کیا ورنہ وہ خاص طور پر ایسی کرامت کا تجربہ کر سکتے تھے۔ علامہ اقبال نے بھی سرسید کی پیروی میں دعاؤں کے لئے گریہ وزاری اور چلہ کشی کی نفی کی اور یہ کہا:

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم
اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

(بانگ درا۔ کلیات اقبال۔ صفحہ 393)

یعنی تو کب تک کوہ طور پر جا کر دیدار الٰہی کی بھیک مانگتا رہے گا۔ تو اپنی ہی ذات سے سینہ کا شعلہ پیدا کر۔

خدا تعالیٰ کے حضور خشوع وخضوع اور گریہ وزاری سب انبیاء اور سب سے بڑھ کر ہمارے پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ ہے۔ خدا تعالیٰ کے در پر اس عاجزی کو ''دریوزہ گری'' قرار دینا انتہائی طور پر بے ادبی اور اباحت ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ علامہ کو اس حقیقت کا بخوبی علم تھا۔ وہ اس کو یوں بیان کرتے ہیں:

اللہ سے کرے دور تو تعلیم بھی فتنہ
املاک بھی، اولاد بھی، جاگیر بھی فتنہ
ناحق کے لئے اُٹھے تو شمشیر بھی فتنہ
شمشیر ہی کیا، نعرۂ تکبیر بھی فتنہ

علامہ خوب جانتے تھے کہ تعلیم کے نتیجہ میں ''اللہ سے دوری'' ایک بہت بڑی آزمائش اور فتنہ ہے۔لیکن خدا تعالیٰ کی ذات کا رسمی اقرار ہی کافی نہیں۔ بلکہ عملی زندگی میں اس کا اظہار بھی ضروری ہے۔صرف نعرۂ تکبیر بلند کرنے سے یہ فرض ادا نہیں ہوتا بلکہ عملی زندگی میں انقلاب ضروری ہے۔صرف ''عشق رسول'' ہی کافی نہیں بلکہ اس عشق کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کی ذات سے عشق کا پیدا ہونا ضروری ہے۔یہی وہ امر ہے جس کا علامہ کی زندگی میں فقدان نظر آتا ہے۔خدا تعالیٰ خالق و مالک ہے۔اس کا ہر صورت میں ظاہری اور دلی احترام ضروری ہے۔اس کی شان میں کسی قسم کی شوخی اور گستاخی کا ہرگز کوئی جواز نہیں۔

خدا تعالیٰ کی ذات ایک ماوراء الوریٰ ہستی ہے جو ظاہری آنکھ سے کبھی اور کسی کو نظر نہیں آسکتی۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (انعام:104)

کہ ظاہری آنکھیں کبھی خدا تعالیٰ کو دیکھ نہیں سکتیں۔

اس لئے خدا تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لئے یہ انتظام کیا ہے کہ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ کہ خدا تعالیٰ اپنے وجود کا ثبوت اپنے انبیاء اور رسولوں کے ذریعہ دیتا ہے اس طرح گویا انسانی آنکھیں اس کو شناخت کر لیتی ہیں۔اب جو آنکھیں بوجوہ اس کو نہیں دیکھ سکتیں بظاہر وہ اس کے وجود کا اقرار کرتے ہیں اور اس پر ایمان لاتے ہیں لیکن ان کے دل منکر ہوتے ہیں۔اس لئے ایسے لوگوں کا خدا تعالیٰ پر ایمان محض لفظی اور رسمی ہوتا ہے اور عام زندگی میں ان کا طریقہ کار:

با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

یعنی خدا تعالیٰ کی ذات کے متعلق جو ان کا دل چاہے برملا کہتے چلے جاتے ہیں لیکن اپنے رسول کے متعلق کسی نازیبا زبان کو برداشت نہیں کر سکتے۔یہی وجہ ہے کہ مغربی دنیا میں جب کوئی خاکہ یا کلمہ آنحضورؐ کی شان کے خلاف شائع ہوتا ہے تمام مسلمان اس کے خلاف سراپا احتجاج بن

جاتے ہیں لیکن خدا تعالیٰ کی ذات کے متعلق کسی ایسے کلمہ سے یا اس کے انکار سے ان کی رگِ حمیت نہیں پھڑکتی۔ لیکن ایک عارف باللہ خدا تعالیٰ کے بارہ میں ''ترسان تر'' ہوتا ہے۔

جنگ اُحد کے موقع پر جب کفار نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے متعلق دریافت کیا تو حضورؐ نے صحابہ کو چپ رہنے کی ہدایت فرمائی لیکن جب کفار نے اُعلُ ھُبَل کا نعرہ لگایا تو آنحضورؐ نے باوجود موقع کی نزاکت کے صحابہ کو اس کا جواب اُونچی آواز میں اَللّٰہ اَعلٰی و اَجَلّ کے الفاظ میں دینے کے لئے ارشاد فرمایا۔ اگر خدا تعالیٰ کی ذات پر ایسا ایمان نہیں تو سیدنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عشق و محبت کا دعویٰ ایک رسمی جذبہ ہے جس کا حقیقی ایمان سے کچھ تعلق نہیں۔ حقیقی عشق محمدی کا یہ طبعی تقاضا ہے کہ خدا تعالیٰ جو ہمارا خالق و مالک ہے اس سے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبت کا اظہار کیا جائے۔ ایک سچا مومن خدا تعالیٰ کے حضور کسی بے ادبی اور گستاخی کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ افسوس ہے کہ علامہ اقبال اپنی شاعرانہ ترنگ میں خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں کئی گستاخیوں کے مرتکب ہوئے اور اسی طرح انہوں نے نئی نسل کو انتہائی غلط اور گمراہ کن پیغام دیا۔ جس کا لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلا کہ وہ خدا تعالیٰ سے دور ہوتے چلے گئے۔ جب مسلمانوں نے خدا تعالیٰ کو چھوڑ دیا تو خدا تعالیٰ نے بھی ان کو چھوڑ دیا۔ اس کی بہت حد تک ذمہ داری علامہ اقبال اور ان جیسے دیگر زعماء کے سر پر ہے۔

فتاویٰ کفر

علامہ اقبال کے انہی خیالات کی بناء پر علماء نے ان پر کفر کے فتاویٰ مختلف مواقع پر لگائے۔ خاص طور پر علامہ کے وہ خطبات جو انہوں نے مدراس اور علیگڑھ میں انگریزی زبان میں دئے اور جن کا اردو ترجمہ ان کی وفات کے تقریباً 20 برس بعد ہوا تھا اور ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے نام سے شائع ہوا۔ ان خطبات میں علامہ نے اس دور میں مغربی اقوام کی

ترقی اور مسلمانوں کی پستی کے پیش نظر بعض اسلامی احکام میں تبدیلی اور ترمیم کی ضرورت پر زور دیا تھا۔اس سلسلہ میں اجتہاد اور اجماع کی تشکیل کا مشورہ دیا۔اس بناء پر علماء نے آپ پر کفر کے فتاویٰ صادر کئے۔اس کا ذکر کرتے ہوئے مصنف ''زندہ رود'' تحریر کرتے ہیں:

''اقبال کا عقیدہ تھا کہ جو شخص دور حاضر میں قرآنی نقطہ نظر سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس (Jurisprudence) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدد اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم ہوگا.....اس مقصد کے حصول کے لئے اجتہاد کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا.....مگر دنیائے اسلام اور بالخصوص ہندوستان کے علماء کی روایتی قدامت پسندی کے پیش نظر یہ ایک نازک مسئلہ تھا اور اقبال کو اس سلسلہ میں اپنے خیالات کے اظہار پر بعض لوگوں نے کافر کہنا شروع کر دیا تھا۔اس کے باوجود وہ عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق اجتہاد کے بارہ میں اپنی تحقیق جاری رکھنا چاہتے تھے۔''

(زندہ رود صفحہ 116 ـ 115)

اسی طرح تحریر فرماتے ہیں:

''علماء بحیثیت مجموعی خطبات کی طرف متوجہ نہ ہوئے مگر جنہوں نے اظہار خیال کی ضرورت محسوس کی ان کے نزدیک بھی اقبال کا نظام فکر مغربی فلسفیوں کے تخلیات پر مبنی تھا اس لئے ان کے افکار کفریات کے سوا کچھ نہ تھے۔''

(زندہ رود صفحہ 154)

درحقیقت علامہ موجودہ حالات اور مغربی اقوام کی ترقیات کی بناء پر اسلام کے بعض احکام کی تبدیلی و تنسیخ ضروری سمجھتے تھے۔چنانچہ خطبات کے دیباچہ میں تحریر کرتے ہیں:

''علماء اور صوفیاء چونکہ عصر حاضر کی نفسیات سے نا آشنا ہیں....پس ضرورت

پیدا ہوگئی ہے علم دین کو سائنٹفک یا فلسفیانہ استدلال کے طور پر پیش کیا جاوے۔ مگر ایسے انداز میں کہ اسلام کی فلسفیانہ روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جدید انسانی افکار کی روشنی میں اس کی افادیت اور اہمیت کو ثابت کیا جاسکے۔ قدیم وجدید کے اس امتزاج سے فکر اسلامی ایک ایسی نئ صورت اختیار کر سکتا ہے جو آج کے بالخصوص مغرب زدہ مسلمانوں کے لئے یقین آفریں اور دلنشیں ہو۔''

(زندہ رود صفحہ 755)

اپنے اس پروگرام کی تکمیل کے لئے علامہ کسی ایسے ''من مرضی'' کے مجدد کی تلاش میں تھے جو یہ کام سرانجام دے سکے۔ کیونکہ جو شخص اس کے علاوہ تجدیدی مشن رکھتا ہے وہ ان کو قابل قبول نہیں۔ حالانکہ قرآن مجید بڑی وضاحت سے بار بار اس کو بیان کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جو شخص اصلاح خلق کے لئے بھیجا جاتا ہے وہ ہمیشہ لوگوں کی 'اہواء' یعنی خواہشات کے برعکس ہوتا ہے۔ مگر علامہ صرف اس شخص کو مجدد ماننے کے لئے تیار تھے جو اسلامی احکام کو زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق بدلنے کی جرأت کا مظاہرہ کرے اور اس کے خلاف جہاد کا اعلان کرے۔ اس سلسلہ میں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، وہ متعدد افراد کو اس کا مظہر سمجھتے رہے۔ مگر ان میں سے کوئی ایسا کارنامہ سرانجام نہ دے سکا اور ان کا انجام نہایت مایوس کن ثابت ہوا۔

○

علامہ اقبال کا فلسفہ خودی یا نیستی

علامہ اقبال کے خدا تعالیٰ سے گلہ اور شکوہ کی اصل بنیاد ان کا مزعومہ فلسفہ خودی تھا۔ انہوں نے اپنا یہ درس خودی غالباً گری پڑی مسلم قوم کو اس لئے دیا تھا تا کہ وہ دنیا میں اپنی عظمت رفتہ کے مطابق غیرت سے جینا سیکھیں۔ وہ اپنی بڑائی کا احساس کریں اور اپنے آپ کو کمزور خیال نہ کریں۔ اگر یہ معاملہ اس حد تک رہتا تو اس میں کوئی حرج نہ تھا۔ لیکن علامہ اپنی شاعرانہ ترنگ میں بہت دور نکل گئے اور عاجز بندوں کو اپنے آقا و مالک اور خالق حقیقی کے مقابل کھڑا کرنے کا درس دینا شروع کر دیا۔ قرآن مجید میں خدا تعالیٰ نے ابلیس کا صرف آدم کے مقابلہ میں یہ دعویٰ درج کیا ہے کہ اس نے کہا: اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ کہ میں آدم سے اپنی ناری خلقت کے لحاظ سے بہتر ہوں۔ اس کا یہ تکبرانہ انداز ہی اس کے تنزل کا باعث ہؤا۔ لیکن علامہ نے عاجز مخلوق کو اپنی ''خودی'' اس قدر بلند کرنے کی تلقین کی کہ وہ بجائے اس کے کہ اپنے خالق حقیقی کے آستانہ الوہیت پر سجدہ ریز ہوں اور اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے احکام کا تابع بنائیں، اُلٹا اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کا تابع ہوجائے اور ان کی مرضی کے مطابق کام کرے۔ علامہ کا خودی کے متعلق ایک مشہور شعر ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خدا تعالیٰ کی ذات اور صفات کے متعلق علامہ کو کچھ بھی ادراک ہوتا تو وہ اس قسم کا گستاخانہ کلمہ منہ سے نہ نکالتے اور نہ ہی مسلمانوں کو اس کا درس دیتے۔ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں انسان کی حیثیت ایک کرم خاکی سے بھی کمتر ہے۔ اگر علامہ نے اپنی زندگی میں یہ طریق اختیار کرنے کی

کسی رنگ میں کوشش کی اور خدا تعالیٰ کی شان میں نازیبا اور گستاخانہ الفاظ استعمال کئے ہیں تو اس ''خودی'' کا ان کو کیا فائدہ پہنچا۔ خدا تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کے باوجود وہ ہمیشہ دوسروں کے دست نگر رہے اور لوگوں کا شکر کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس کا کسی قدر اندازہ مصنف ''زندہ رود'' کے بیان کردہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''سر راس مسعود کی کوششیں بالآخر کامیاب ہوئیں اور انہوں نے اس ماہ کے آخر میں اقبال کو اطلاع دی کہ نواب بھوپال نے ان کے لئے پانچ سو روپے ماہوار تاحیات وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔''

اقبال نے انہیں اپنے ایک دوسرے خط مورخہ 30 مئی 1935ء میں جواب دیا:

> ''میں کس زبان سے اعلیٰ حضرت کا شکریہ ادا کروں، انہوں نے ایسے وقت میں میری دستگیری فرمائی جب کہ چاروں طرف سے آلام و مصائب میں محصور تھا۔ باقی آپ کا کیا شکریہ ادا کروں۔ مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی سادات کی آبائی میراث ہے، بالخصوص آپ کے خاندان کی۔''

(زندہ رود صفحہ 1076)

اگر ''اعلیٰ حضرت'' کے معمولی وظیفہ مقرر کرنے پر علامہ شکر ادا کرتے ہیں تو کیا یہی شکر خدائے عزوجل کے حضور ضروری نہ تھا لیکن علامہ اس سے تہی کش رہے اور اس کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کرتے رہے۔ خود کہتے ہیں:

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

نہ معلوم علامہ کے ذہن میں خدا تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کے متعلق کیا تصور تھا کہ وہ اس کی شان میں گستاخی کو معمولی امر خیال کرتے ہیں۔ کس قدر شوخی سے کہتے ہیں:

در دشتِ جنوں من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

(پیام مشرق ۔غزل نمبر 24)

میرے جنون کے صحرا میں جبریل ایک گرا پڑا اشکار ہے۔
اے ہمت مردانہ اب خدا پر کمند پھینک۔

علامہ نے اپنے منظوم کلام میں جا بجا بے محابہ طور پر خدا تعالیٰ کے متعلق ایسے الفاظ اور تراکیب استعمال کی ہیں جو سراسر خدا تعالیٰ کی شان اور مقام کے منافی ہیں اور ایک انسان کے لئے ہرگز مناسب نہیں کہ وہ اپنے خالق حقیقی کو ان الفاظ میں یاد کرے۔ ہم اپنے دنیوی رشتوں اور بلند مقام پر فائز لوگوں کی عزت وتکریم کرتے ہیں اور ہرگز یہ جرأت نہیں کرتے کہ ان کی شان کے خلاف کوئی کلمہ اپنی زبان سے نکالیں۔ پھر خدا تعالیٰ جو ہمارا خالق و مالک ہے اس کے متعلق یہ جرأت کیوں؟ ذرا علامہ کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

(بانگ درا۔کلیات اقبال ۔صفحہ 463)

خدائے عزوجل کے متعلق ''دامن یزداں چاک'' کا اظہار انتہائی طور پر نازیبا ہے۔ اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کے ذہن میں خدا تعالیٰ کے متعلق انتہائی ناقص تصور تھا۔ ورنہ تمام عارف باللہ ہمیشہ ''ترساں تر'' ہوتے ہیں اور وہ کبھی بھی ایسی جرأت رندانہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔ اس زمانہ میں حضرت بانی جماعت احمدیہ کا خدا تعالیٰ اور سیدنا آنحضرت ﷺ سے عشق ومحبت جنون کی حد تک تھا مگر یہ جنون آداب اور احکام خداوندی کی ادائیگی میں مدومعاون تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

تا نہ دیوانہ شدم، ہوش نیامد بسرم
اے جنوں گرد تو گردم کہ چہ احساں کردی

میں بھی جب تک دیوانہ نہ ہو گیا تھا، میرے سر میں ہوش نہ آیا تھا۔(اللہ تعالیٰ کے)عشق کے جنون میں تجھ پر قربان، تو نے مجھے پر کتنا احسان کیا ہے۔ (البدر۔16اپریل1904ء)

ایک حقیقی مومن اور سالک خدا تعالیٰ کے عشق میں سرشار اور دیوانہ ہوتا ہے اور ہر وقت خدا تعالیٰ کے احسانات کا دل کی گہرائیوں سے شکر ادا کرتا رہتا ہے۔اس کی زبان ہر وقت خدا تعالیٰ کے ذکر اور شکر سے رطب اللسان رہتی ہے۔اس کے برعکس علامہ کی زندگی میں اس کا شدید فقدان ہے۔وہ خدا تعالیٰ کے خلاف شکوہ، گلہ اور طعنہ زنی میں انتہائی طور پر بے باک تھے۔

جب خدا تعالیٰ کی ذات کے متعلق ایسا ناقص خیال ہو تو پھر اس کے شکر کی کہاں ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے خیر و برکت سے محروم رہے اور اعلیٰ تعلیم اور کوائف کے باوجود کوئی ڈھب کا کام حاصل نہ کر سکے جس کے نتیجہ میں علامہ کی گھریلو زندگی نہایت تنگی ترشی میں گزری۔

علامہ کے بیٹے جسٹس جاوید اقبال نے اپنی کتاب میں برملا یہ اعتراف کیا ہے:

’’اقبال کی ساری زندگی معاشی تنگی میں گذری۔‘‘ (زندہ رود۔صفحہ 818)

علامہ کی گھریلو’’معاشی تنگی‘‘ کا کسی قدر اندازہ قارئین کو مکرم جسٹس جاوید کی اس شہادت سے بخوبی ہو سکتا ہے جو انہوں نے اپنی تالیف’’اپنا گریبان چاک‘‘ میں درج کی ہے۔آپ تحریر فرماتے ہیں:

’’میں نے چند بار ماں باپ میں تکرار ہوتے بھی دیکھی ہے۔ایک مرتبہ تو میری والدہ کا اصرار تھا کہ وہ باقاعدگی سے وکالت کریں کیونکہ گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے۔نیز کرایہ کی کوٹھی میں رہنے کی بجائے اپنا گھر بنوائیں۔یہ منظر اب

تک میری نگاہوں کے سامنے ہے کہ میری والدہ میرے والد کے ذاتی کمرہ میں کھڑی انہیں کوس رہی ہیں اور روتے ہوئے کہہ رہی ہیں کہ میں اس گھر میں ایک لونڈی کی طرح کام کرتی ہوں اور ساتھ ہی پیسے بچانے کی کوشش میں لگی رہتی ہوں۔ دوسری طرف آپ ہیں کہ بجائے نیک نیتی سے کچھ کرنے کے بستر پر دراز شعر لکھتے رہتے ہیں اور جواب میں میرے والد لیٹے ہوئے بغیر کچھ منہ سے بولے کھسیانی ہنسی ہنس رہے ہیں۔'' (اپنا گریبان چاک۔صفحہ 20)

اس واقعہ کا ذکر مکرم جسٹس جاوید صاحب نے اپنی کتاب ''زندہ رود'' میں بھی کیا ہے۔ دراصل اس قسم کے گھریلو جھگڑے ہر اس گھر میں ہوتے ہیں جہاں معاشی مشکلات ہوں۔ ان حالات میں ہمیشہ اہل خانہ کی اپنے شوہر سے اس قسم کی شکایات جائز ہوتی ہیں۔ جسٹس صاحب کی والدہ کا علامہ سے یہ جھگڑا اس وقت ہؤا جب وہ بچہ تھے۔ اس دور میں وہ اپنی والدہ کی آنکھوں سے رواں آنسو کیسے بھول سکتے تھے۔ یہ واقعہ ان کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔ لیکن کیا یہ امر عجیب نہیں کہ علامہ کے غیر معمولی علمی اور ادبی کوائف اور سیاسی تعلقات کے باوجود، وہ کوئی ایسا کام نہ کر سکے جس سے ان کو باقاعدہ ماہوار آمدن ہوتی تا کہ کم از کم گھر کا چولہا باعزت طور پر چلتا رہتا۔

ایسے حالات میں علامہ کی ''خودی'' کہاں باقی رہ جاتی ہے جبکہ وہ اپنے گھر کے معمولی اخراجات چلانے کے لئے دوسروں کے دست نگر رہے۔ درحقیقت یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے خدا تعالیٰ کے متعلق ناقص ظن کے مطابق جوابی سلوک تھا۔

ہمیں یقین ہے کہ جیسے علامہ نے لوگوں کا شکرادا کیا ہے اگر اسی طرح اپنے خالق حقیقی کی دی ہوئی نعماء کا شکرادا کرتے تو صورتِ حال بہت مختلف ہوتی۔

اس زمانہ کے امام سیدنا حضرت اقدس مسیح موعودؑ نے اپنی جماعت کو ''خودی'' کے مٹانے اور اس کے مقابلہ میں ''نیستی'' کو اپنانے کی تلقین فرمائی ہے۔ آپ نے نظم ونثر میں اس مضمون کو

خوب کھول کر بیان فرمایا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

محبت ہے کہ جس سے کھینچا جاؤں
خدائی ہے خودی جس سے جلاؤں
وہ دیکھے نیستی رحمت دکھاوے
خودی اور خودروی کب اس کو بھاوے

(دُرِّثمین۔صفحہ 55)

یعنی خودی صرف خدا تعالیٰ کی ذات بابرکات کے لئے ہے۔ اس کے مقابلہ میں انسان کے لئے نیستی یعنی اپنے آپ کو لاشئے سمجھنا ضروری ہے۔ یہاں یہ امر بھی واضح ہوتا ہے کہ وہی فلسفہ اور راستہ صحیح ہے جو خود خدا تعالیٰ یا اس کے فرستادے بیان کرتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں انسانی سوچ اور فلسفہ گمراہی کی طرف لے جا سکتا ہے۔ اس کی واضح مثال یہی علامہ کا فلسفہ خودی ہے۔ علامہ نے اسے مسلمانوں کی ترقی کا راستہ بتایا ہے اور اس کے مقابلہ میں امام زمانہ نے اسے تباہی و بربادی کا راستہ بتایا ہے اور مسلمانوں کو خدا تعالیٰ کے حضور جھکنے اور ہمیشہ عاجزی اور انکساری اختیار کرنے اور تکبر سے بچنے کی تلقین فرمائی۔

اے کرمِ خاک! چھوڑ دے کبر و غرور کو
زیبا ہے کبر حضرتِ ربِّ غیور کو

(دُرِّثمین۔صفحہ 113)

حقیقت یہ ہے کہ علامہ کا فلسفہ خودی خدا تعالیٰ کی شانِ کبریائی کے سراسر خلاف ہے اور نوجوان نسل کو دہریت کی طرف لے جانے والا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس کی قباحت کو پوری وضاحت سے ردّ کیا جائے اور واشگاف الفاظ میں اس کی مذمت کی جائے۔

○

کشمیر کمیٹی کا قیام اور علامہ اقبال

علامہ اقبال کی طرف سے جماعت احمدیہ سے موافقت کے دور میں ایک نہایت ہی مثبت کام کشمیری قوم کی آزادی کے سلسلہ میں ہوا۔ کشمیر کے مسلمان ایک عرصہ سے ڈوگرہ راج کی غلامی میں غیر انسانی سلوک اور مظالم کا شکار تھے۔ اس سلسلہ میں 1933ء میں شملہ میں بعض مسلم عمائدین کی کوشش سے کشمیر کمیٹی کا قیام عمل میں آیا اس کمیٹی کی صدارت علامہ اقبال کے اصرار پر امام جماعت احمدیہ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کے سپرد کی گئی۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ جماعت احمدیہ ایک منظم جماعت ہے اور وہ اپنے وسائل سے اس مشکل کام کو بہتر طور پر سرانجام دے سکتی ہے۔ علامہ اقبال کا یہ انتخاب اس لحاظ سے بہت مفید ثابت ہوا اور جلد ہی کشمیریوں کے مردہ جسم میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑنے لگی۔ دو سال کے قلیل عرصہ میں کشمیری مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف ایک موثر آواز بلند ہونا شروع ہوئی اور کشمیریوں کی آزادی کے سلسلہ میں امام جماعت احمدیہ کی سرکردگی میں نہایت ہی موثر پیش رفت ہوئی۔

عین اس موقع پر جب یہ مہم اپنے منطقی نتائج کی طرف رواں دواں تھی احرارِ اسلام جن کو مسلمان ان کی بدنام زمانہ کارروائیوں کی وجہ سے ''غدارِ اسلام'' کے نام سے یاد کرتے تھے، درمیان میں کود پڑے اور فرقہ واریت کو ہوا دی اور جماعت احمدیہ کے خلاف جھوٹے الزامات کا سلسلہ شروع کیا۔ اور خاص طور پر علامہ اقبال کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے کوشش کی اس زمانہ میں علامہ کو وائسرائے کونسل میں چوہدری ظفر اللہ خان کے تقرر سے ذاتی طور پر زک بھی پہنچی تھی۔ اس لئے وہ احرار کے ہمنوا بن گئے اور جماعت احمدیہ کے خلاف اس مہم کا حصہ بن گئے۔ ان حالات میں حضرت امام جماعت احمدیہ نے کشمیر کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور اس

کمیٹی کی صدارت علامہ اقبال کے سپرد کر دی گئی۔ اس کے بعد اس کمیٹی کا جو حشر ہوا وہ کشمیری مسلمانوں کی تاریخ کا ایک نہایت ہی افسوسناک باب ہے۔

یہ امر انتہائی طور پر افسوسناک ہے کہ علامہ اس وقت احرار کی اس چال کو نہ سمجھ سکے اور ان کے نرغہ میں پھنس گئے۔ اس وقت ان کا فرض بنتا تھا کہ جس شخصیت کو انہوں نے خود کشمیر کمیٹی کی صدارت کے لئے منتخب کروایا تھا اس کے خلاف اٹھنے والی ہر تحریک کا مقابلہ کرتے اور احرار کے بدعزائم کو مسلم قوم کے سامنے بے نقاب کرتے۔ لیکن بدقسمتی سے علامہ بجائے دفاع کرنے کے خود ان کے ہمنوا بن گئے۔ ''جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے''

آج جب ہم مڑ کر تاریخ کے اس دور کو دیکھتے ہیں یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ علامہ کا اس وقت کا یہ رویہ نہ صرف کشمیری مسلمانوں کی آزادی کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا بلکہ پاکستان کے لئے ایک ایسا مسئلہ بن گیا کہ جس کے خوفناک نتائج آج بھی پوری مسلم قوم بھگت رہی ہے۔

آج اقبالیات کے دلدادہ علامہ اقبال کے قائداعظم سے تعلقات مسلم لیگ سے وابستگی اور ان کے پاکستان کا خواب دیکھنے کے متعلق بہت کچھ لکھ رہے ہیں۔ لیکن ہم اس امر کو قطعاً بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے ایک وقت میں ان احرار کا ساتھ دیا جو قائداعظم اور مسلم لیگ کے شدید خلاف تھے اور کانگریس کا ساتھ دے رہے تھے چنانچہ خود مصنف زندہ رود اس کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''اقبال مسلم سیاسی لیڈروں کے نفاق اور فتنہ تراشیوں یا مسلم عوام کے انتشار سے بڑے برگشتہ خاطر تھے۔ برصغیر میں ملت اسلامیہ کی ہم آہنگی، سالمیت یا اس کی اساسی تنظیم کے نصب العین کی تحصیل کے لئے ان کی کوششیں اب تک کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکی تھیں۔ اس دور میں برصغیر میں مسلم سیاسی جماعتوں کی تعداد بیس سے اوپر جاچکی تھی اور ہر مسلم سیاسی جماعت کا مسلک دوسری جماعت سے مختلف تھا۔'' (زندہ رود۔صفحہ 1050)

اس سلسلہ میں وہ خاص طور پر احرار کے متعلق لکھتے ہیں:

''پنجاب کی مجلس احرار جمیعت علماءہند سے وابستہ تھی کشمیر ایجی ٹیشن کے دنوں میں پنجاب میں اسے مقبولیت حاصل ہوئی لیکن بعد میں اس جماعت پر لکھنؤ میں شیعہ سنی فساد کرانے کی ذمہ داری ڈالی گئی۔'' (زندہ رود صفحہ 1050)

احرار کی تمام تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں میں باہمی عداوت اور انتشار کو پروان چڑھایا۔اس سلسلہ میں انہوں نے جماعت احمدیہ کی مخالفت اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لئے کی۔مصنف زندہ رود نے پنجاب میں کشمیر ایجی ٹیشن کے سلسلہ میں احرار کی جس مقبولیت کا ذکر کیا ہے۔یہ وہی موقع ہے کہ جب انہوں نے امام جماعت احمدیہ کی کشمیر کمیٹی کی صدارت کے خلاف مہم چلائی۔لیکن عجیب امر یہ ہے کہ کشمیر کمیٹی کی صدارت کے لئے امام جماعت احمدیہ کا نام خود علامہ نے تجویز کیا تھا۔اب اگر احرار نے اس کے خلاف ہنگامہ آرائی شروع کی تھی تو علامہ کا یہ اخلاقی فرض بنتا تھا کہ وہ اس کے متعلق احرار کو منہ توڑ جواب دیتے۔لیکن اس کے بالکل برعکس خود علامہ ان کے ہم نوا بن گئے۔اور اس طرح احرار کو پنجاب میں مقبولیت حاصل ہوئی۔واضح ہے کہ احرار کی اس مقبولیت کی تمام تر ذمہ واری علامہ پر عائد ہوتی ہے۔اسی مقبولیت کی بناء پر احرار نے تحریک پاکستان کی شدید مخالفت کی۔قائداعظم کی تکفیر کی اور مسلم لیگ کو نیچا دکھانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی اور کانگریس کی نمک حلالی کا حق ادا کیا۔اگر علامہ زندہ رہتے تو وہ خود دیکھتے کہ احرار نے مسئلہ ختمِ نبوت کی آڑ میں نہ صرف کشمیریوں کی آزادی کی مہم کو سبوتاژ کیا بلکہ آئندہ پاکستان کے قیام کے لئے بے پناہ مشکلات پیدا کیں۔

پھر جیسا کہ مصنف نے تحریر کیا کہ احرار کانگریس سے وابستہ تھے اور مسلمانوں میں باہمی انتشار پیدا کرنا ان کے ایجنڈا کا حصہ تھا۔اگر پنجاب میں انہوں نے جماعت احمدیہ کی مخالفت کی آڑ میں اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کی تو ہندوستان میں لکھنؤ میں شیعہ سنی کے اختلافات کو ہوا دی۔

واضح ہے کہ اگر لکھنؤ میں انکا کردار قابل نفریں تھا تو پنجاب میں وہ کیسے قابل تحسین تھا۔لیکن علامہ کی سادگی کی انتہاء ہے کہ وہ بعد میں مسلمانوں کے افتراق اور انتشار سے پریشان تھے اگر غور کیا جائے تو درحقیقت اس انتشار کے وہ خود ذمہ دار تھے اگر وہ احرار کے آلہ کار نہ بنتے اور تکفیر کے خارزار میں نہ الجھتے تو مسلمانوں کے اتحاد کی راہ ہموار ہوسکتی تھی چنانچہ یہی وہ سنہری اصول تھا جسے قائداعظم نے اپنایا اور مسلم لیگ کے دروازے ہر اس شخص کے لئے کھول دیئے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا تھا۔اس بنا پر باوجود تمام فرقہ پرست گروہوں کی شدید مخالفت کے وہ کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ جماعت احمدیہ کے متعلق احرار کی طرح ایسی آواز علامہ عبدالحامد بدایونی اور ان کے ہمنواؤں نے اٹھائی لیکن قائداعظم نہایت سختی سے اپنے موقف پر قائم رہے اور یہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔آج اقبالیات کے طلباء کا یہ فرض بنتا ہے کہ علامہ کی اس کمزوری اور مداہنت کا کھلے دل سے اعتراف کریں اور ان کی شخصیت پر ملمع سازی سے احتراز کریں۔

آج خود احراری لیڈر اس امر کا اعتراف کر چکے ہیں کہ انہوں نے کشمیر کمیٹی کی مخالفت کانگریسی لیڈروں کے ایماء پر کی تھی چنانچہ مشہور کانگرسی اور احراری لیڈر مولوی حبیب الرحمن لدھیانوی جو بعد میں مسلمانوں میں ''مولوی بوکا'' کے نام سے مشہور ہوئے اپنی کتاب ''رئیس الاحرار'' میں لکھتے ہیں:

> ''ہم نے موجودہ کشمیر کمیٹی (جس کے صدر امام جماعت احمدیہ تھے۔ناقل) کی سیاسی سازش،ڈاکٹر اقبال کی کشمیر کمیٹی میں شمولیت،سر فضل حسین کی سرپرستی اور انگریزی حکومت کی بدنیتی،فرقہ وارانہ فسادات اور ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں مولانا آزاد (ابوالکلام آزاد۔ناقل) سے تفصیلی گفتگو کی تو مولانا آزاد نے سن کر کہا کہ احرار کو فرقہ وارانہ اتحاد کے لئے مسئلہ کشمیر کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے۔''

(رئیس الاحرار صفحہ 38)

گویا کانگریسی راہنما مولانا ابوالکلام آزاد نے احرار کے سپرد یہ مشن کیا کہ وہ کسی طرح موجودہ کشمیر کمیٹی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کریں۔ اس مشن کی تکمیل کے لئے احرار کے لئے دو اہم مشکلات تھیں۔

1۔ احرار اپنی کانگرس نواز پالیسی کی وجہ سے مسلمانوں میں اپنا وقار کھو چکے تھے۔ کوئی ان پر اعتبار کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔

2۔ دوسرے کشمیر کمیٹی جس کے صدر امام جماعت احمدیہ تھے اسے علامہ اقبال کی پوری پشت پناہی حاصل تھی۔ اس لئے اس کی جگہ لینا اتنا آسان نہ تھا۔

اس غرض کے لئے احرار نے ایک طرف تو یہ پروپیگنڈہ کرنا شروع کیا کہ اگر کشمیر کمیٹی اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگئی تو سارا کشمیر ''قادیانی'' ہو جائے گا اور دوسری طرف علامہ اقبال کو اس کمیٹی سے الگ کرنے کے لئے کوششیں شروع کردیں۔ بدقسمتی سے اس عرصہ میں وائسرائے کونسل میں ان کے تقرر کی جو قوی اُمید تھی، وہ پوری نہ ہوئی اور ان کی جگہ حکومت نے چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان صاحب کا تقرر کر دیا۔ علامہ کے لئے یہ محرومی ایک ابتلاء بن گئی۔ اس لئے جب احرار نے علامہ کو جماعت احمدیہ سے بدظن کرنے کے لئے کوششیں شروع کیں تو وہ بہت جلدی ان کی سازش کا شکار ہو گئے۔ چنانچہ مجلس احرار کے ایک رسالہ نے اس دور میں علامہ اقبال اور احراری لیڈروں کی باہمی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

> ''حضرت امیر شریعت (جناب سید عطاء اللہ شاہ بخاری) ڈاکٹر اقبال کو مرشد اور ڈاکٹر اقبال حضرت شاہ صاحب کو پیر جی کہا کرتے تھے۔ کشمیر کمیٹی کے سلسلہ میں ان دونوں کے درمیان چوہدری فضل حق کی معیت میں کئی ملاقاتیں ہوئیں اور طے پایا کہ بشیر الدین محمود احمد اور عبدالرحیم درد کو اگر ان کی موجودہ ذمہ داری سے نہ ہٹایا گیا تو کشمیر کے 32 لاکھ مظلوم مسلمان کفر و ارتداد کا شکار ہو جائیں گے۔ لہٰذا

بہتر ہے کہ تحریک آزادی کشمیر کی باگ ڈور مجلس احرار کے سپرد کردی جائے۔''

(مجلس احرار کا رسالہ ''تبصرہ'' لاہور۔اشاعت اکتوبر 1965ء بحوالہ تاریخ احمدیت جلد 6 صفحہ 607 حاشیہ)

اسی طرح مولوی لدھیانوی نے ان ملاقاتوں کی مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا:

''حضرت شاہ صاحب (مراد مولانا انور شاہ کاشمیری ۔ ناقل) نے تحریک خلافت کے زمانے سے لے کر تحریک احرار کے زمانہ تک میری اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سرپرستی فرمائی۔انہوں نے قادیانیوں کے بارے میں جماعت احرار کا نقطۂ نظر، اسلام میں ختمِ نبوت کی بنیادی اہمیت سمجھانے کے لئے سر ڈاکٹر محمد اقبال سے ملاقات کی۔ڈاکٹر اقبال کو اپنا ختمِ نبوت کا رسالہ پڑھ کر سنایا۔اس کے فوراً بعد ہی ڈاکٹر اقبال نے کشمیر کمیٹی کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا جس کے صدر مرزا بشیر الدین محمود قادیانی تھے۔اس طرح ڈاکٹر اقبال نے مرزائیت کے چنگل سے نجات پائی اور اسلام کے صحیح اعتقادات پر عقیدہ رکھنے کی ڈاکٹر صاحب کو توفیق حاصل ہوئی۔اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے قادیانیوں کے خلاف مضامین لکھے۔''

(''رئیس الاحرار'' صفحہ 100)

ہمیں اس امر کا گلہ اور افسوس نہیں کہ علامہ نے جماعت احمدیہ کی مخالفت کیوں کی۔وہ جس قدر چاہتے مخالفت کرتے کیونکہ ہم کسی بڑے سے بڑے فرد یا گروہ کی مخالفت سے نہیں ڈرتے لیکن احرار کا علامہ کو جماعت کی مخالفت کے لئے آمادہ کرنا ایک نہایت مذموم مقصد کے لئے تھا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ ایک عرصہ سے کشمیری قوم جو ڈوگرہ راج کے غیر انسانی مظالم کا شکار تھی اب امام جماعت احمدیہ کی دو سال کی محنت شاقہ سے ان کے اندر ایک نئی زندگی پیدا ہوئی تھی۔دنیا کو ان کے مسائل کا علم ہوا تھا اور وہ بھی ان کے لئے آواز بلند کرنے لگے تھے۔اس انقلاب کو احراری اس لئے روکنا چاہتے تھے کیونکہ یہ ڈوگرہ راج اور ان کے کانگریسی نیتاؤں کے مفاد کے

خلاف تھا۔ ایسے موقع پر علامہ کے لئے یہ امر زیب نہ دیتا تھا کہ وہ کانگریس نواز علماء کا ساتھ دیتے۔ حالانکہ ان کو بخوبی معلوم تھا کہ کشمیر کمیٹی کشمیریوں کے لئے مثبت اور مفید کام سرانجام دے رہی ہے۔ خود انہوں نے آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقدہ مارچ 1932ء میں اپنے خطبہ صدارت میں اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے مجھے ان واقعات کے تاریخی پس منظر میں جانے کی ضرورت نہیں جو حال ہی میں رونما ہوئے ہیں ایسی قوم کا دفعتاً جاگ اُٹھنا جس میں شعلہ خودی بجھ چکا ہو، غم و مصائب کے باوجود ان کے لئے مسرت کا باعث ہے۔'' (حرف اقبال۔صفحہ 67)

امام جماعت احمدیہ نے اپنے دوسالہ دورِ صدارت میں کشمیری مسلمانوں کے نیم مردہ جسم میں ایک نئی زندگی کی روح پھونک دی تھی۔ لیکن مسلم قوم کی بدقسمتی ہے کہ ان میں میر جعفر جیسے غدار پیدا ہوتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان حالات میں امام جماعت احمدیہ نے کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ آپ کی جگہ علامہ کو صدر بنا دیا گیا۔ آپ کو خود اعتراف تھا کہ وہ ''گفتار کے غازی'' تو ضرور تھے لیکن قوت عمل مفقود تھی۔ چنانچہ یہ قوم آج تک آزادی سے ہمکنار نہ ہوسکی۔

مذہب اسلام کا استحصال

الغرض کشمیر کمیٹی کے سلسلہ میں احرار اسلام نے جماعت احمدیہ کی مخالفت ہرگز ''تحفظِ ختمِ نبوت'' کے لئے نہیں کی تھی بلکہ ان کا اصل مقصد کانگریس کے ایماء پر کشمیر میں ڈوگرہ راج کا تحفظ تھا۔ افسوس اس وقت بعض مسلم عمائدین بشمول علامہ اقبال احرار کے اس طریقہ واردات کا صحیح ادراک نہ کرسکے اور وہ بھی احرار کی پیدہ کردہ اس مذہبی منافرت کا حصہ بن گئے۔

احرار نے جماعت احمدیہ کے خلاف جس مہم کا آغاز کشمیر کمیٹی کے سلسلہ میں 1933ء میں کیا

تھا وہ قیام پاکستان کے بعد بھی بڑھتی چلی گئی۔ چنانچہ جسٹس جاوید اقبال نے، ان مذہبی تنظیموں کے نفاذ اسلام کے پس پردہ جو عزائم تھے، اس کا تجزیہ اپنی آپ بیتی ''اپنا گریبان چاک'' میں یوں بیان کیا ہے:

''پاکستان میں جب بھی کسی حکومت کو گرانا مقصود ہو تو عموماً اسلام کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال میں لایا جاتا ہے۔ بھٹو کی مخالف سیاسی جماعتوں کے اکٹھ نے بھی نظام مصطفیٰ تحریک کے تحت ان سے زیادہ تر مذہبی مطالبات ہی کئے۔ مثلاً احمدیوں کو اقلیت قرار دو، اتوار کی بجائے جمعہ کی چھٹی کرو، گھڑ دوڑ پر جوا بند کرو، شراب بند کرو وغیرہ۔ بھٹو نے اپنی کرسی محفوظ کرنے کی خاطر سب مطالبات مان لئے لیکن سیاسی جماعتوں کی تسلی نہ ہوئی۔ دراصل ان کا مقصد کسی قسم کا اسلام کا نفاذ نہ تھا بلکہ کسی نہ کسی طریقہ سے بھٹو کو ہٹانا تھا۔''

(اپنا گریبان چاک۔صفحہ 162)

مکرم جسٹس صاحب نے پاکستان میں مذہبی تحریکات کا جو تجزیہ پیش کیا ہے وہ صحیح اور برحق ہے۔ ان جماعتوں کا مقصد ہرگز نظام مصطفیٰ کا نفاذ نہ تھا بلکہ حصول اقتدار تھا۔ اس بارہ میں ہماری عرض یہ ہے کہ بعینہٖ 1935ء میں احرار اسلام ہرگز تحفظ ختمِ نبوت نہیں چاہتے تھے بلکہ اس تحریک کی آڑ میں کانگریس کے ایماء پر ڈوگرہ راج کا تحفظ چاہتے تھے۔ درحقیقت وہ جماعت احمدیہ کی مخالفت کے پردہ میں اپنے بدعزائم کی تکمیل چاہتے تھے۔ ان عزائم کا اظہار کھل کر اس وقت ہؤا جب قائداعظم نے مسلم لیگ کی قیادت میں قیام پاکستان کی تحریک شروع کی اور احرار نے کھل کر اس کی مخالفت کی۔

○

مجلس احرار اور علامہ اقبال

گزشتہ باب میں ہم کشمیر کمیٹی کے سلسلہ میں احرار کی بعض تخریبی سرگرمیوں کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اقبال اکیڈمی کی طرف سے علامہ کی زندگی اور فلسفہ وغیرہ کے متعلق نت نئی کتب بڑی کثرت سے شائع کی جارہی ہیں، لیکن علامہ کے مجلس احرار سے تعلقات اور مراسم وغیرہ کے متعلق کچھ تحریر نہیں کیا گیا۔ حالانکہ علامہ کی زندگی کے آخری چند سالوں میں ان کے احرار اور ان کے زعماء کے ساتھ کافی گہرے تعلقات تھے اور علامہ نے ان سے متاثر ہو کر اپنی گزشتہ روش سے ہٹ کر کئی اقدامات کئے۔ اس بارہ میں جسٹس جاوید اقبال نے بھی ''زندہ رود'' میں صرف ہلکا پھلکا ذکر کیا ہے اور تفصیل میں جانے سے گریز کیا ہے۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ احرار کی تاریخ محب وطن مسلمانوں کیلئے باعث شرم ہے اور کوئی ان سے اپنا تعلق جوڑنا پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ جسٹس صاحب احرار کے متعلق رقمطراز ہیں:

''اقبال اور مجلس احرار کے نظریات میں ہمیشہ فرق رہا۔ مجلس احرار خلافت کمیٹی کی کوکھ سے نکلی تھی اور نظریات کے اعتبار سے جمعیت علماء ہند کی طرح نیشنلسٹ مسلمانوں کی جماعت اور کانگریس کی ہمنوا تھی۔ احراری قائدین نے عام طور پر اقبال اور ان کے نظریات کی مخالفت کی۔ تحریک کشمیر اور بعد میں احمدیوں کے خلاف تحریک کے دوران احراریوں کو پنجاب میں کچھ مقبولیت حاصل ہوئی۔ مگر تحریک مسجد شہید گنج کے دوران مجلس احرار نے خاموشی اختیار کر کے مسلمانان پنجاب کی ہمدردیاں کھو دیں۔ مجلس احرار پارلیمانی سیاسی جماعت کبھی بھی نہ بن

سکی۔ وہ محض ایک ہنگامی سیاسی جماعت کے طور پر اُبھری تھی اور اسی شکل میں ختم ہو
گئی.... بہرحال مجلس احرار ہمیشہ نیشنلسٹ مسلمانوں کی جماعت رہی اور جمعیت
العلماء ہند اور کانگریس کی حمایت کرتی رہی۔'' (زندہ رود۔صفحہ 710)

جسٹس صاحب کا احرار کے متعلق یہ تجزیہ بہت درست ہے۔ احرار کی اس کُھلی کانگریس نواز پالیسی کے باوجود اس دور میں علامہ اقبال نے احرار کی کیوں ہمنوائی کی اور ان کی اسلام دشمنی سے کیوں صرف نظر کیا، اس کے متعلق اُس زمانہ کے حالات اور تاریخی پس منظر کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

علامہ اقبال کی احرار سے ہمنوائی

علامہ کی احرار کی ہمنوائی کی بھی عجیب داستان ہے۔ علامہ جب گول میز کانفرنس میں شرکت اور اسلامی ممالک کی سیاحت کے بعد لاہور واپس آئے اس وقت آل انڈیا مسلم کانفرنس کا اجلاس مارچ 1932ء میں ہوا۔ علامہ اس کانفرنس کے صدر تھے۔ آپ نے اپنے صدارتی خطبہ میں کشمیر کمیٹی کی کارکردگی کی برملا تعریف کی۔ علامہ کی طرف سے کشمیر کمیٹی کی کارکردگی دراصل صدر کشمیر کمیٹی حضرت امام جماعت احمدیہ کی تعریف تھی۔ احرار یہ تعریفی کلمات کب برداشت کر سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اگلے روز مسلم کانفرنس کے اجلاس کو ناکام بنانے کا پروگرام بنایا۔ خاص طور پر ان کا ہدف علامہ تھے۔ جونہی دوسرے دن کے اجلاس کی کارروائی میں شرکت کے لئے علامہ پنڈال میں داخل ہوئے تو احرار نے غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا۔ اس کی تفصیلی رپورٹ انڈین اینوئل رجسٹر میں یوں درج ہے:

'' آج کانفرنس کا آخری اجلاس شورہ پشتی کے مظاہروں کی نذر ہو

گیا۔ اجلاس کی کاروائی دو گھنٹے تاخیر سے شروع ہوئی اور جونہی سر محمد اقبال پنڈال میں داخل ہوئے، ان کے ساتھ احراریوں کے ایک بڑے گروہ نے بھی داخل ہونے کی کوشش کی جنہیں روک دیا گیا۔ اس پر کانفرنس کے والینٹروں اوراحراریوں میں گیٹ پر باقاعدہ رسہ کشی شروع ہوگئی۔ اس کے نتیجہ میں باہم لاٹھیاں چلیں اور خشت باری ہوئی۔ بالآخر پولیس نے مداخلت کر کے مظاہرین کو منتشر کر دیا۔لیکن جونہی پولیس ہٹی، شورہ پشتی پھر شروع ہوگئی اور کانفرنس کی کاروائی بغیر کسی بحث وتمحیص کے جلد جلد ریزولیوشن کو پاس کرنے کی شکل میں تبدیل ہوگئی اور تمام ریزولیوشن انتہائی عجلت کے ساتھ اس صورت حال میں پاس ہوئے کہ پنڈال کے باہر ایک مجمع (احرار) پنڈال میں داخل ہونے کے لئے کوشاں تھا اور مختلف النوع نعرے لگا رہا تھا۔''

(انڈین اینوئل رجسٹر۔22مارچ1932ء)

لازمی طور پر احرار اپنی اس حرکت سے علامہ کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ اگر علامہ کی کشمیر کمیٹی میں شرکت اور تعاون برقرار رہا تو مسلمان ان کی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس وقت علامہ جو مسلم قوم میں اپنی ہر دلعزیزی اور پذیرائی کا گراف بلند سے بلند تر دیکھنا چاہتے تھے، انہوں نے بجائے احرار کی اس مفسدانہ حرکت کی مذمت کرنے کے اُلٹا ان سے مصالحت کا طریق اختیار کیا۔ چنانچہ مصنف ''زندہ رود'' لکھتے ہیں:

''کشمیر کمیٹی کے دوران ممکن ہے اقبال نے احرار رہنماؤں سے مفاہمت کرنے کے بعد ان کی حوصلہ افزائی کی ہو۔'' (''زندہ رود''۔صفحہ 1133)

جسٹس صاحب نے ''ممکن ہے'' کے الفاظ سے اپنے والد علامہ اقبال کی پہاڑ جتنی بڑی

غلطی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ یہ وقت احرار کی اس قبیح حرکت سے صرف نظر اور دلجوئی کا نہ تھا بلکہ ان اسلام دشمن عناصر کو کھل کر بے نقاب کرنے کا تھا۔ جسٹس صاحب علامہ کی احراریوں کی اس حوصلہ افزائی کی ایک ممکنہ وجہ یہ بیان کرتے ہیں:

''اقبال کا اصل مقصد ایسی ہنگامی سیاسی جماعتوں کا مسلم لیگ کے ساتھ اتحاد کرانا تھا تا کہ پنجاب میں انہیں یونینیسٹ پارٹی کے مقابلے میں کھڑا کیا جا سکے۔ احراری لیڈر جوشیلے مقرر ہونے کے سبب عوام میں مقبول تھے اور انہیں پنجاب کے مسلمانوں میں مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنانے کی غرض سے استعمال میں لایا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور میں محمد علی جناح کو جب یونینیسٹ پارٹی کے لیڈر سر فضل حسین نے ٹکا سا جواب دے دیا تو وہ اقبال کے مشورے کے بعد مجلس اتحاد ملت اور پھر مجلس احرار کے قائدین سے ملے اور ان قائدین نے کچھ پس وپیش کے بعد مسلم لیگ میں شامل ہونے کی حامی بھر لی۔ مگر یہ تعلق زیادہ مدت تک قائم نہ رہ سکا۔ مجلس اتحاد ملت کے لیڈر پہلے اور مجلس احرار کے لیڈر کچھ مدت بعد اپنی اپنی اغراض حاصل نہ ہو سکنے کے سبب مسلم لیگ سے الگ ہو گئے۔ بہر حال مجلس احرار نیشنلسٹ مسلمانوں کی جماعت ہی رہی اور جمعیۃ العلماء ہند اور کانگریس کی حمایت کرتی رہی۔'' (زندہ رود۔صفحہ 39۔1138)

جسٹس صاحب نے علامہ کی احرار کی حوصلہ افزائی کو درست ثابت کرنے کے لئے جو امکانی وجہ بیان کی ہے، وہ دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے۔ جب علامہ اور احرار کے نظریات میں اختلاف تھا اور وہ بخوبی جانتے تھے کہ احرار کانگریس کا پروردہ گروپ ہے اور ان کا مذہبی لبادہ محض مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے ہے اور جماعت احمدیہ کی مخالفت اور ختمِ نبوت کی

حفاظت کی آڑ میں وہ کانگریس کے ایماء پر کشمیر میں ڈوگرہ راج کو بچانا چاہتے تھے۔اس موقع پر بجائے علامہ کے کشمیر کمیٹی کے دفاع کے جس کے وہ خود سرکردہ ممبر تھے اور خود انہوں نے اس کی صدارت کا فریضہ جماعت احمدیہ کے امام کو اصرار کر کے سونپا تھا، اُلٹا احرار کے پروپیگنڈہ کے ترجمان بن گئے۔ یہ موقع ہرگز احرار کی ہمنوائی کا نہ تھا بلکہ ان کی نقاب کشائی کا تھا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ علامہ کی یہ حوصلہ افزائی کسی لحاظ سے مسلم لیگ کے لئے مفید ثابت نہ ہوئی بلکہ احرار نے اپنی اس مقبولیت کا فائدہ اُٹھا کر مسلم لیگ کی شدید مخالفت اور مزاحمت کی اور حضرت قائداعظم اور ان کی تحریک قیام پاکستان کے راستہ میں بے پناہ مشکلات کھڑی کیں۔

اگر اس دور کے حالات کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ علامہ کی اس وقت احرار کی ہمنوائی بہت گہرے اور خطرناک حالات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ احرار کی جماعت احمدیہ کی مخالفت کی پالیسی ہمیشہ سے تھی۔1933ء میں علامہ نے کشمیر کمیٹی کی صدارت حضرت امام جماعت احمدیہ کے سپرد کی تھی اور ان کو بخوبی معلوم تھا کہ ان کے اس اقدام کو مخالفین جماعت احمدیہ پسند نہیں کریں گے۔ اس وقت انہوں نے اس کی پرواہ کئے بغیر یہ بظاہر ''ناممکن مشن'' حضرت امام جماعت احمدیہ کے سپرد کیا۔ پھر انہوں نے خود دیکھا کہ کشمیریوں میں ایک نئی زندگی کی لہر پیدا ہونی شروع ہوئی۔ خود ڈوگرہ راج کو اپنی فکر دامن گیر ہوئی۔ اس موقع پر انہوں نے اپنے پرانے نمک خواروں یعنی احرار اسلام کو مدد کے لئے آواز دی۔ کانگریسی لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کو کشمیر کمیٹی کے کام کو اپنے ہاتھ میں لینے کا مشورہ دیا۔ اس موقع پر احرار کشمیریوں کی ہمدردی کے جذبہ سے میدان میں نہیں کودے تھے بلکہ اپنے ذاتی مفاد کے لئے آگے آئے تھے۔ لیکن ان کو بخوبی معلوم تھا کہ ان کی غداری اور اسلام دشمنی کے نتیجہ میں عوام ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اپنی ساکھ قائم کرنے کے لئے انہوں نے علامہ اقبال کو

اپنا ہمنوا بنانے کی سوچی اور اس کے لئے ہر ممکن جتن کئے۔ افسوس یہ ہے کہ اس وقت علامہ اقبال ان کی مخالفت کرنے کے بجائے خود ان ساتھ دینے کے لئے بوجوہ تیار ہو گئے۔ اس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ کشمیریوں کے حقوق کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا بلکہ اس کے نہایت دور رس منفی نتائج سامنے آئے اور مسلمانان ہند غیر معمولی مشکلات سے دوچار ہوئے۔ احرار نے اس بناء پر بعد میں تحریک پاکستان کی کھل کر مخالفت کی۔ قائد اعظم کی کردار کشی کے لئے ہر ممکن کوشش کی اور سب سے بڑھ کر ان کے اس اقدام سے تحریک آزادی کشمیر کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا۔ اگر اس وقت علامہ اقبال احرار کی ہمنوائی نہ کرتے بلکہ انکے خطرناک عزائم سے امت مسلمہ کو خبر دار کرتے تو ان کو تحریک پاکستان کی مخالفت کی ہرگز جرأت نہ ہوتی۔

یہ امر افسوس ناک ہے کہ آج مصنف ''زندہ رود'' جسٹس جاوید اقبال اور ان کے ہمنوا علامہ اقبال کے پاکستان بنانے کے خواب کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس امر کا ذکر تک نہیں کرتے کہ 1935ء میں علامہ کی طرف سے احرار کی ہمنوائی آئندہ تحریک پاکستان کے لئے کس قدر مصائب اور مشکلات کا موجب ہوئی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس وقت احرار نے جماعت احمدیہ کی مخالفت کسی مذہبی اختلاف کے باعث شروع نہ کی تھی بلکہ وہ کانگریس کے ایماء پر یہ چاہتے تھے کہ حضرت امام جماعت احمدیہ کی سرکردگی میں کشمیری عوام کے حقوق کی بحالی کے لئے جو تحریک کامیاب ہو رہی تھی اور ڈوگرہ راج کو یہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ آئندہ غریب اور محکوم کشمیریوں کے خلاف من مانی کاروائی نہ کر سکیں گے، اس بناء پر انہوں نے احرار پر اپنی نوازشات نچھاور کیں اور یہ ایجنڈا ان کے سپرد کیا کہ وہ اس تحریک آزادی کشمیر کے روح رواں حضرت امام جماعت احمدیہ کے خلاف کام کریں۔

احراری لیڈر پرانے سیاسی شاطر تھے۔ انہوں نے ایک طرف جماعت احمدیہ کے خلاف

مذہبی مہم چلائی اور دوسری طرف کشمیر کمیٹی کے سرکردہ فرد علامہ اقبال کو جو کشمیر کمیٹی کے اہم رکن تھے ان کو ''تحفظِ ختمِ نبوت'' کے نام پر بدظن کرنے کی کوشش کی اور ان کو یہ باور کرایا کہ مسلمان بجائے امام جماعت احمدیہ کے ان کو کشمیر کمیٹی کے صدر کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے۔احرار کو بخوبی معلوم تھا کہ کشمیر کمیٹی سے امام جماعت احمدیہ کی علیحدگی سے کشمیری قوم کی انسانی حقوق کی بحالی کی کامیاب مہم خود بخود ختم ہوجائے گی۔یہی وہ مشن تھا جو کانگریس نے احرار کے سپرد کیا تھا۔ چنانچہ احرار اپنی اس مذموم سازش میں کامیاب ہوئے۔علامہ کشمیر کمیٹی کے صدر بن گئے اور احرار ان کے منظورِ نظر ٹھہرے۔

افسوس ہے کہ اس وقت علامہ نے احرار کی ہمنوائی اور حوصلہ افزائی کا جو فیصلہ کیا وہ انتہائی خطرناک عواقب پر منتج ہؤا۔اس کا سب سے زیادہ فائدہ احرار کو اس لحاظ سے پہنچا کہ عوام میں ان کی ساکھ بحال ہوئی۔اس بناء پر آئندہ انہوں نے تحریک پاکستان اور حضرت قائداعظم کے خلاف نہایت گھناؤنا کردار ادا کیا۔اگر اس وقت علامہ اقبال احرار کی اس سازش کا ادراک کرتے اور ان کے آلۂ کار نہ بنتے تو صورت حال بہت مختلف ہوتی۔افسوس علامہ جلد راہیٔ ملک عدم ہو گئے۔اگر زندہ رہتے تو بچشم خود دیکھتے کہ ان کی احرار کے لئے پشت پناہی کس قدر امت مسلمہ کے لئے خطرناک ثابت ہوئی۔

اندریں حالات ہماری صرف اس قدر گزارش ہے کہ علامہ کی خدمات گنوانے والے اصحاب کا یہ فرض بنتا ہے کہ جہاں وہ اس امر کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں کہ علامہ نے اس مملکت کا خواب دیکھا تھا وہاں ان کو یہ بھی تحریر کرنا چاہئے کہ اپنی وفات سے قبل علامہ نے احرار کی ہمنوائی کی تھی جنہوں نے کانگریس کے آلۂ کار بن کر تحریک پاکستان کو ناکام بنانے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا تھا۔احرار نے جب علامہ کے خلاف شورش کی تو علامہ کا اس وقت یہ فرض بنتا تھا کہ وہ

ان عناصر کا مقابلہ کرتے اور ان کی شرارت کو طشت از بام کرتے لیکن افسوس ہے کہ علامہ نے اس وقت بجائے ان کی حوصلہ شکنی کرنے کے اُلٹا ان کی حوصلہ افزائی اور ہمنوائی کا طریق اختیار کیا۔ اصل مسئلہ اس وقت 'ختمِ نبوت' کا نہ تھا وہ تو صرف احرار نے اپنی ساکھ کی بحالی کے لئے اُٹھایا تھا بلکہ اصل معاملہ ظلم اور بربریت کا شکار کشمیری قوم کے انسانی حقوق کی بحالی کا تھا۔ مسلمانوں کے باہمی اختلافات کی خلیج بہت وسیع ہے۔ یہ تو ہمارا اندورنی معاملہ ہے جسے ہم کسی وقت بھی افہام تفہیم سے طے کر سکتے تھے۔ اصل مسئلہ اس وقت مسلمان کشمیری قوم کی مدد کا تھا اور ہمیں متحد ہو کر دشمن کا مقابلہ کرنا تھا۔ لیکن بجائے اس کے ہم خود ہی الجھ کر رہے گئے جس کی وجہ سے اچھی بھلی صحیح سمت کی طرف بڑھتی ہوئی گاڑی پٹڑی سے لڑھک گئی اور کشمیری بجائے اس کے کہ ڈوگرہ راج کے مظالم سے چھٹکارا پاتے آہستہ آہستہ مزید مظالم کا شکار ہوتے چلے گئے اور آج تک کشمیری قوم اپنی آزادی کے لئے ترس رہی ہے۔

○○